حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

فردنامہ-۲

کلیم عاجز

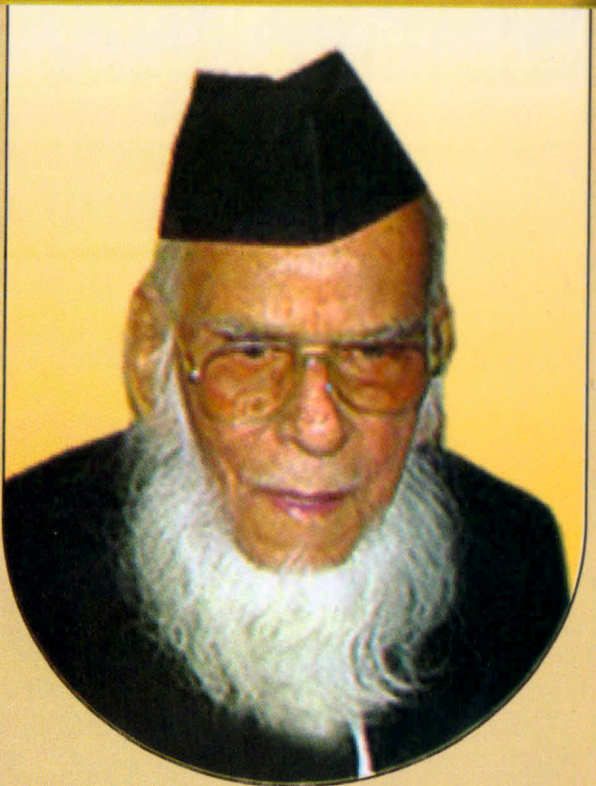

اسلم جاوداں

Monograph-2

Kaleem Aajiz

By Aslam Jawedan

کلیم عاجز دبستان بہار کی شعری عظمت کا نشان ہیں۔ انھوں نے بہار کو بین الاقوامی شناخت عطا کی اور پوری دنیائے سخن میں اپنی شاعرانہ رفعت کی دھوم مچا دی۔ اپنے ہم عصروں میں ان کا لب ولہجہ منفرد اور ممتاز ہے۔ کلیم عاجز نے متعدد شعری ونثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل گوئی کے حوالے سے ان کی شناخت نہایت نمایاں، روشن اور محترم ہے۔

کلیم عاجز کی شاعری کا حقیقی آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوا اور ان کے شاعری میں اسیر ہونے کا بنیادی سبب ۱۹۴٦ء کا وہ فرقہ وارانہ فساد تھا، جس میں ان کی والدہ اور چھوٹی بہن شہید ہوگئی تھیں۔ یہ سانحہ کلیم عاجز کو ایک ایسا ابدی اور لازوال دردوغم کا سرمایہ دے گیا، جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔ شاید اسی لئے انھوں نے اپنے پہلے دلکش مجموعۂ کلام کا نام ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' رکھا۔ کلیم عاجز اگر اس سانحۂ عظیم سے دوچار نہ ہوتے تو دل سوزی اور دردناکی کی پُرتاثیر کیفیت جو مذکورہ مجموعۂ کلام میں در آئی ہے، وہ شاعری کے پیکر میں نہیں ڈھل پاتی اور نہ ہی وہ دل گرفتہ غیر معمولی نثر کا وجود سامنے آتا، جو انھوں نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہیں، جو ہمارے جذبات واحساسات کے ساتھ ہمارے روح کو بھی زخمی کر دیتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ کلیم عاجز نے اس سانحہ کو بے مثال شاعری کا پیراہن عطا کیا ہے۔

کلیم عاجز نے بہت ساری شخصیاتی نظمیں، نعت، رباعیاں، قطعات اور سہرے لکھے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی غزلیہ رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے۔ کلیم عاجز ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ایک صاحب طرز انشاء پرداز بھی ہیں، جن کی نثر غیر معمولی حسن اور انفرادیت کی حامل ہے۔

اس فردنامے (مونوگراف) کے مصنف ڈاکٹر اسلم جاوداں اردو ڈائرکٹوریٹ میں اردو پروگرام افسر اور اس کے ترجمان ''بھاشا سنگم'' کے نائب مدیر ہیں۔ تحریر ہو یا تقریر، ادارت ہو یا ترتیب وتہذیب یا انتظامی نظم وضبط، ہر میدان میں اپنا نقش ثبت کرتے ہیں۔ کلیم عاجز سے انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے۔ کلیم عاجز کے شعری مجموعے ''جب فصلِ بہار آئی تھی'' اور ''ہاں چھیڑو غزل عاجز'' کو ترتیب دینے کا شرف بھی انہیں حاصل رہا ہے۔ انھوں نے کلیم عاجز کی شخصیت اور ادبی خدمات پر باضابطہ تحقیقی کام بھی کیا، جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ.ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ ''کلیم عاجز: ایک شخص ایک فنکار'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ موصوف کی یہ کتاب کلیم عاجز شناسی کے باب میں جہاں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے وہیں تحقیق وتنقید کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ انھوں نے کلیم عاجز پر اس فردنامے کی تدوین کو بطریق احسن انجام دیا۔ امید قوی ہے کہ ادبی حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

کلیم عاجز

ڈاکٹر اسلم جاوداں

ناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۲

Kaleem Aajiz

By

Dr. Aslam Jawedan

نام کتاب	:	کلیم عاجز
مصنف	:	ڈاکٹر اسلم جاوداں
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	136
کمپوزنگ وتزئین	:	محمد سعید احمد
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔۴

رابطہ : 9334020186

ملنے کا پتہ :

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

مشمولات

- پیش لفظ: امتیاز احمد کریمی ۴
- ڈاکٹر کلیم عاجزؔ : ایک معروضی مطالعہ اسلم جاوداں ۶

عنوانات

- کلیم عاجزؔ کا شجرہ نسب وحسب ۹_۱۰
- ڈاکٹر کلیم عاجزؔ: تاریخ کے آئینے میں (پیدائش سے لے کر ۱۵ فروری ۲۰۱۵ء تک) ۱۱
- ابتدائی حالاتِ زندگی ۱۷
- شاعری کی ابتدا ۲۷
- شاعری کا محرّک و آغاز ۳۱
- کلیم عاجزؔ اور مشاعرہ ۳۵
- 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا......' ایک مختصر تعارف ۴۵
- 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی......' ایک مختصر تعارف ۴۸
- 'ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ' : ایک مختصر تعارف ۵۰
- کلیم عاجزؔ اور خدائے سخن میرؔ ۵۲
- دیگر اصنافِ شاعری ۶۹
- کی نثری تصانیف کا مختصر تعارف ۸۰
- کلیم عاجزؔ کی نثر میں بولیوں کا استعمال ۹۵
- انتخابِ کلام عاجزؔ ۱۰۵

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعروادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سربلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی وشعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، فضلِ حق آزاد، شوقؔ نیموی، انجمؔ مانپوری، یاسؔ یگانہ چنگیزی، بیدلؔ عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیلؔ عظیم آبادی، کلیم احمد عاجزؔ، رضا نقوی واہیؔ، واقف عظیم آبادی، رمزؔ عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفرپوری، غیاث احمد گدّی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعروادب بجا طور ناز کرسکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعروادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدردان ہے، نیز ان کے ادبی وشعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان وادب کی قدرومنزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری وادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شادؔ عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجزؔ، سہیلؔ عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہیؔ، وہاب اشرفی، رمزؔ عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفرپوری پر فردنامے شائع کئے جارہے ہیں۔

کلیم عاجزؔ دبستان بہار کی شعری عظمت کا نشان ہیں۔ انھوں نے بہار کو بین الاقوامی شناخت عطا کی اور پوری دنیائے سخن میں اپنی شاعرانہ رفعت کی دھوم مچا دی۔ اپنے ہم عصروں میں ان کا لب ولہجہ منفرد اور ممتاز ہے۔ کلیم عاجزؔ نے متعدد شعری ونثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل گوئی کے حوالے سے ان کی شناخت نہایت نمایاں، روشن اور محترم ہے۔

کلیم عاجزؔ کی شاعری کا حقیقی آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوا اور ان کے شاعری میں اسیر ہونے کا بنیادی سبب ۱۹۴۶ء کا وہ فرقہ وارانہ فساد تھا، جس میں ان کی والدہ اور چھوٹی بہن شہید ہوگئی تھیں۔ یہ سانحہ کلیم عاجزؔ کو ایک ایسا ابدی اور لازوال درد وغم کا سرمایہ دے گیا، جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔ شاید اسی لئے انھوں نے اپنے پہلے دلکش مجموعۂ کلام کا نام ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' رکھا۔ کلیم عاجزؔ اگر اس سانحۂ عظیم سے دوچار نہ ہوتے تو دل سوزی اور دردناکی کی پُر تاثیر کیفیت جو مذکورہ مجموعۂ کلام میں در آئی ہے، وہ شاعری کے پیکر میں نہیں ڈھل پاتی اور نہ ہی وہ دل گرفتہ غیر معمولی نثر کا وجود سامنے آتا، جو انھوں نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہیں، جو ہمارے جذبات واحساسات کے ساتھ ہمارے روح کو بھی زخمی کر دیتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ کلیم عاجزؔ نے اس سانحہ کو بے مثال شاعری کا پیراہن عطا کیا ہے۔

کلیم عاجز نے بہت ساری شخصیاتی نظمیں، نعت، رباعیاں، قطعات اور سہرے لکھے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی غزلیہ رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے۔ کلیم عاجزؔ ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ایک صاحب طرز انشاء پرداز بھی ہیں، جن کی نثر غیر معمولی حسن اور انفرادیت کی حامل ہے۔

اس فردنامے (مونوگراف) کے مصنف ڈاکٹر اسلم جاوداں اردو ڈائرکٹوریٹ میں اردو پروگرام افسر اور اس کے ترجمان ''بھاشا سنگم'' کے نائب مدیر ہیں۔ تحریر ہو یا تقریر، ادارت ہو یا ترتیب وتہذیب یا انتظامی نظم وضبط، ہر میدان میں اپنا نقش ثبت کرتے ہیں۔ کلیم عاجزؔ سے انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے۔ کلیم عاجز کے شعری مجموعے ''جب فصلِ بہار آئی تھی'' اور ''ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ'' کو ترتیب دینے کا شرف بھی انہیں حاصل رہا ہے۔ انھوں نے کلیم عاجزؔ کی شخصیت اور ادبی خدمات پر باضابطہ تحقیقی کام بھی کیا، جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ. ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ ''کلیم عاجزؔ: ایک شخص ایک فنکار'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ موصوف کی یہ کتاب کلیم عاجز شناسی کے باب میں جہاں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے وہیں تحقیق وتنقید کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ انھوں نے کلیم عاجزؔ پر اس فردنامے کی تدوین کو بطریق احسن انجام دیا۔ امید قوی ہے کہ ادبی حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

امتیاز احمد کریمی

کلیم عاجز: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

کلیم عاجزؔ کی پیدائش ۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۶ء (۱۹۲۴ء اسکول ریکارڈ کے مطابق) کو قدیم پٹنہ ضلع کے تیلہاڑا بستی میں ہوئی، ان کے والد کا نام شیخ کفایت حسین اور والدہ کا نام امت الفاطمہ تھا۔ ابتدائی تعلیم ان کے نانا ضمیر الدین کے مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں پٹنہ مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی شان سے پاس کیا اور پوری ریاست میں چھٹا مقام حاصل کیا۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی سے اردو آنرس کے ساتھ بی-اے اور اردو ادب میں ایم-اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں امتحانات میں سرفہرست رہے۔ ۱۹۶۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ-ڈی کی ڈگری ملی۔ ۱۹۶۵ء میں ہی پٹنہ یونیورسٹی کے پٹنہ کالج، پٹنہ میں لکچرر کے عہدے پر بحال ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں وہیں سے بحیثیت ریڈر سبکدوش ہوئے۔

کلیم عاجزؔ کا نام برصغیر کی اردو شاعری کا ایک مقتدر، معروف اور مقبول نام ہے، جسے دبستان بہار کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی بے مثل اور خوبصورت شاعری کے ذریعہ پوری دنیا میں اپنی شاعرانہ برتری اور عظمت کا لوہا منوا لیا۔ ان کی شاعری میں احساس کی شدت، فکر کی ندرت اور پیش کش کی جو دل پذیری ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی شاعری جدید فکر ونظر کی حامل کلاسیکی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

کلیم عاجز ایک منفرد اور امتیازی شان کے حامل بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثر میں بلا کی دلکشی، بے پایاں شدت احساس اور غضب کی اثر پذیری ملتی ہے۔ ان میں قدروں کے زوال کی داستان اور ان کی بازیافت کی تڑپ ہے۔ کلیم عاجزؔ نے اپنی دلکش شاعری اور بے مثل نثر نگاری سے دنیائے شعروادب میں جیسی قدر ومنزلت، شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان کی مایہ ناز تصنیف ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا...'' (جس میں نثر نگاری اور شاعری دونوں کے دل پذیر نمونے ہیں) کی ایک لاکھ سے زائد کاپیاں اب تک فروخت ہو چکی ہیں۔

کلیم عاجزؔ ملک اور بیرون ملک میں مشاعروں کی شان تھے۔ کوئی بھی بڑا مشاعرہ ان کی شمولیت

کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اعلیٰ شاعری اور لازوال نثری تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کر دیا اور عالمی سطح پر شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے ساتھ ریاست بہار کو ایک اعلیٰ پہچان عطا کی، جس پر اہالیانِ بہار کو بجا طور پر ناز ہے۔

اہم تصانیف

مجموعہ غزل : (۱) وہ جو شاعری کا سبب ہوا... (۲) جب فصلِ بہاراں آئی تھی... (۳) ہاں چھیڑو غزل عاجز...

آپ بیتی : (۱) جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی... (۲) ابھی سن لو مجھ سے...

تحقیق : دفترِ گم گشتہ

سفر نامے : (۱) اک دیس اک بدیسی... (سفر نامۂ امریکہ)
(۲) یہاں سے کعبہ کعبہ سے مدینہ (سفر نامۂ حج)

مجموعۂ نظم : کوچۂ جاناں جاناں...

خطوط کا مجموعہ : دیوانے دو

دیگر تصانیف : (۱) پہلو نہ دکھے گا...
(۲) میری زبان میرا قلم (مجموعہ مضامین دو حصوں میں)
(۳) پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا
(۴) वो जो शाइरी का सबब हुआ... (دیوناگری رسم الخط میں)

انعامات و اعزازات

- حکومتِ ہند نے ان کی اعلیٰ خدماتِ شعر و ادب کے اعتراف میں جنوری ۱۹۸۹ء میں 'پدم شری' کے ایوارڈ سے نوازا۔
- محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار نے ۲۰۰۱ء میں ایک لاکھ اکیاون ہزار کا مولانا مظہر الحق شیکھر سمان ایوارڈ عطا کیا۔
- ۲۰۱۲ء میں غالب اکیڈمی، دہلی نے ۷۵ ہزار روپے کے غالب ایوارڈ، توصیفی سند اور میمنٹو سے سرفراز کیا۔
- ان کے علاوہ بھی کلیم عاجز کو درجنوں ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ دیے گئے۔

انتقال: ۱۵ر فروری ۲۰۱۵، ہزاری باغ (جھارکھنڈ) میں چھوٹی بیٹی ڈاکٹر شمیمہ کلیم کے گھر پر۔

تدفین: سمن پورہ قبرستان، راجا بازار، پٹنہ

منتخب اشعار عاجز

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

سلگنا اور شے ہے جل کے مر جانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

میں کیا سناؤں حال دل اب قابلِ بیاں نہیں
زخم کدھر کدھر نہیں درد کہاں کہاں نہیں

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے

فن میں نہ معجزہ نہ کرامات چاہیے
دل کو لگے بس ایسی کوئی بات چاہیے

ادھر آؤ تمہاری زلف ہم آراستہ کر دیں
جو گیسو ہم سنواریں گے کبھی برہم نہیں ہوں گے

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دھواں اٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

میں نگاہ باغباں میں کوئی اور ہو گیا ہوں
ابھی چار ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ

محبت کرنے والے بھی عجب خوددار ہوتے ہیں
جگر پر زخم لیں گے زخم پر مرہم نہیں لیں گے

ابھی کلیم کو پہچانتا نہیں کوئی
یہ اپنے وقت کی گدڑی میں لال ہے پیارے

اس کی فکر نہ کیجیو کون یہاں کیا بولے ہے
کرنے والے کام کرے ہے بولنے والا بولے ہے

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

موسم کے بدلتے ہی بدل جاتی ہیں آنکھیں
یاران چمن بھول گئے نام ہمارا

وہ کسی کی انجمن ہو وہ کسی کی بادشاہی
یہی بانکپن رہے گا یہی اپنی کجکلاہی

یہ شہسوار وقت ہیں اتنا نشے میں چور
گر جائیں گے اگر یہ اُتارے نہ جائیں گے

بہت ہے شرح غم کے واسطے اک قطرہ آنسو کا
کہانی اتنی دلکش ہوگی جتنی مختصر ہوگی

میٹھی میٹھی بات تمہاری محفل محفل جانے ہے
لیکن تم بے درد ہو کیسے میرا ہی دل جانے ہے

چہروں کو اگر غور سے دیکھو گے تو اکثر
آنسو بھی تبسم کے نقابوں میں ملیں گے

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل سے پتھر پھینک گئے
جس کو چوٹ لگی ہے پیارے اس کا ہی دل جانے ہے

اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

زمانہ سنگ سہی آئینے کی خو رکھیو
جو دل میں رکھیو وہی سب کے رو برو رکھیو

گذر جائیں گے جب دن گذرے عالم یاد آئیں گے
ہمیں تم یاد آؤ گے تمہیں ہم یاد آئیں گے

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

— اسلم جاوداں

کلیم عاجزؔ شجرۂ نسب

- شیخ بدرالحسن (دادا)
  - شیخ شجاعت حسین
  - شیخ کفایت حسین
    - محمد سلیم احمد
    - محمودہ خاتون
    - 'محمد کلیم' احمد
      - محمد وسیم احمد
      - نجمہ خاتون
      - احمد فاطمی
      - ارشد فاطمی
      - امجد فاطمی
      - شمیمہ خاتون
    - سعیدہ خاتون
    - محمد علیم احمد
    - محمد نسیم احمد
    - رشیدہ (شہید) خاتون
  - شیخ ہدایت حسین

کلیم عاجزؔ شجرۂ حسب

- محمد اکبر علی (نانا)
  - مولوی امیرالدین
  - مولوی ضمیرالدین
    - امت الفاطمہ (شہید)
      - محمد سلیم احمد
      - محمودہ خاتون
      - 'محمد کلیم' احمد
        - محمد وسیم احمد
        - نجمہ خاتون
        - احمد فاطمی
        - ارشد فاطمی
        - امجد فاطمی
        - شمیمہ خاتون
      - سعیدہ خاتون
      - محمد علیم احمد
      - محمد نسیم احمد
      - رشیدہ (شہید) خاتون
    - قمرالنساء

ڈاکٹر کلیم عاجزؔ: تاریخ کے آئینے میں

(پیدائش سے لے کر ۱۵؍فروری ۲۰۱۵ء تک)

۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۶ء : پیدائش (اسکول کے ریکارڈ کے مطابق ۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۴ء)

۱۹۳۲ء : ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے نانا مولوی سید ضمیر الدین کے مکتب سے کیا

۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء : کلکتہ میں والد صاحب کے ساتھ قیام

۱۹۳۶ء : الفنٹسن تھیٹر، کلکتہ میں آغا حشر سے ملاقات

۱۹۳۷ء : زندگی میں پہلی غزل کہی اور پہلی بار عاجزؔ تخلص استعمال کیا

۱۹۳۹ء : پٹنہ مسلم ہائی اسکول (پٹنہ) میں نویں درجہ میں داخلہ لیا اور ڈبل پروموشن حاصل کیا۔ پٹنہ کالج کے بزم ادب کے فی البدیہہ مشاعرہ میں شرکت کی اور اوّل انعام حاصل کیا۔

۱۹۴۱ء : میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ پورے بہار میں پانچویں پوزیشن اور چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔
آئی.اے میں داخلہ لیا۔ بی.این کالج کے موضوعاتی انعامی مقابلے میں اقبالؔ پر ایک نظم لکھ کر اوّل انعام حاصل کیا۔

۱۹۴۱ء : والد کا انتقال۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۴۲ء : رئیس پٹنہ ''شیخ کنواں'' کی پوتی انوار فاطمہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔

۱۹۴۴ء : مستقل طور سے پٹنہ میں سکونت پذیر ہوئے اور بی این کالج کے سامنے بیڈنگ کا کاروبار شروع کیا۔

۱۹۴۶ء : بہار میں ہولناک فساد شروع ہوا۔ تلہاڑا میں ماں، چھوٹی بہن اور ۲۲؍رشتہ داروں کو کھویا۔
نومبر کے اواخر میں پٹنہ میں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ چھوٹے بھائی نسیم احمد کی تلاش میں لاہور پہنچے اور وہاں دسمبر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب سے ملاقات کی۔

۱۹۴۹ء : مشاعرے میں شرکت کی غرض سے پہلی غزل کہی اور پہلی بار مشاعرے میں شرکت کی۔ جسے 'انجمن رفیق الشعراء' نے لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی میں منعقد کیا تھا۔

۱۹۵۱ء : پہلی بار پٹنہ سے باہر جمشید پور مشاعرے میں بلائے گئے، جسے 'بزمِ فرح' نے منعقد کیا تھا۔

۱۹۵۴ء : تعلیمی سلسلہ پھر سے شروع کیا اور باڑھ کالج سے سنٹ اپ ہو کر نالندہ کالج، بہار شریف، بہار یونیورسٹی سے پرائیوٹ طور سے آئی.اے کیا۔

۱۹۵۶ء : بی.اے آنرس (اُردو) میں پٹنہ یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا اور چار طلائی تمغے سے سرفراز کئے گئے۔ پہلا تمغہ اوّل مقام حاصل کرنے پر، دوسرا تمغہ امتیازی نمبر یعنی ڈسٹنکشن حاصل کرنے پر، تیسرا تمغہ اردو کمپوزیشن میں سرفہرست رہنے پر اور چوتھا تمغہ بی.این کالج کے طالب علم کو پہلی بار طلائی تمغہ ملنے پر کالج کی جانب سے حاصل ہوا۔

۱۹۵۸ء : ایم.اے (اُردو) میں پٹنہ یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا اور طلائی تمغہ سے سرفراز کئے گئے۔

۱۹۶۰ء : ان کی پہلی کتاب 'مجلس ادب' (یادگار شعری مجلسوں کی روداد) شائع ہوئی۔

۱۹۶۰ء : تبلیغی جماعت سے منسلک ہوئے اور بہار کے ''امیر جماعت'' بنائے گئے۔

۱۹۶۵ء مارچ : پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پٹنہ کالج (پٹنہ یونیورسٹی) میں لکچرر ہوئے۔

۱۹۶۵ء اگست : 'اورینٹل کالج'، پٹنہ سیٹی میں لکچرر ہوئے۔ پی ایچ-ڈی کے لیے وزارتِ تعلیم، حکومت ہند کی جانب سے وظیفہ ملا۔

۱۹۶۶ء : پہلی بار ہندستان سے باہر جدّہ، مشاعرے میں بلائے گئے اور پہلا حج بھی کیا۔

۱۹۷۵ء : اپنی غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا، جسے 'بزمِ کاف' نے جنوری ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔

۱۹۷۶ء (۱۹ر فروری) : 'بزمِ کاف' کے زیر اہتمام ان کی غزلوں کے مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کا اجرا بڑے تزک و احتشام کے ساتھ صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد کے ہاتھوں 'وِگیان بھون' دلّی میں ہوا۔

۱۹۷۸ء : ہندستانی سفارت خانہ، جدہ کے مشاعرے میں پہلی بار مدعو کئے گئے، پھر پاکستان مشاعرے میں بھی بلائے گئے اور دوسرا حج کیا۔

۱۹۷۹ء : مئی میں پاکستان مشاعرے میں بلائے گئے پھر 'مسلم کمیونیٹی سنٹر' کی دعوت مشاعرہ پر امریکہ گئے اور پھر لوٹتے ہوئے دوبارہ دسمبر میں پاکستان تشریف لے گئے۔

۱۹۸۰ء : خودنوشت ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی...'' شائع ہوئی۔

۱۹۸۱ء : جشنِ ماہر القادری میں پاکستان گئے، اس کے بعد دُبئ، ابوظہبی اور شارجہ کے مشاعروں میں شرکت کی اور پھر ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کی دعوت (اقبال سمینار) پر دوبارہ امریکہ گئے۔ ان کی نثری تصانیف 'ایک دیس اک بدیسی'، 'یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ'، شائع ہوئیں۔

: میر اکادمی، لکھنؤ نے 'امتیازِ میر' ایوارڈ سے نوازا۔

۱۹۸۲ء (جنوری) : پاکستان میں امت الفاطمہ اکیڈمی (کراچی) نے ان کی غزلوں کا مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' طبع دوم شائع کیا۔

۱۹۸۳ء : پاکستان مشاعرے میں شرکت کے لیے بلائے گئے۔

۱۹۸۴ء (اکتوبر) : شعبہ اُردو، پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے بحیثیت ریڈر، ملازمت کی مدّت مکمل کر سبکدوش ہوئے۔

۱۹۸۴ء (۳۱ر اکتوبر) : مشاعرے میں شرکت کے لیے امریکہ تشریف لے گئے، پھر کناڈا گئے اور ٹورنٹو میں 'انجمن ترقی اُردو' کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرہ میں بھی شرکت کی اور اس کے بعد لگ بھگ ہر سال یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۸۵ء (۲۶ر جنوری) : فجر میں نماز کی حالت میں دورۂ قلب کا احساس ہوا۔ گھر آکر حالت غیر ہوگئی اور فوراً داخلِ اسپتال ہوئے۔

۱۹۸۶ء (ماہِ رمضان) : سعودی عرب اور پاکستان کا دوَرہ کیا۔

۱۹۸۷ء : اہلیہ کے ساتھ سعودی عرب تشریف لے گئے اور حج کے بعد واپس ہوئے اور اس کے بعد لگ بھگ یہی سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۸۸ء (فروری) : 'انڈو قطر اردو سوسائٹی' کی دعوت پر قطر تشریف لے گئے۔

۱۹۸۹ء (جنوری) : حکومت ھند نے ان کی خدماتِ اردو ادب کے اعتراف میں انہیں 'پدم شری' کے خطاب سے نوازنے کا اعلان کیا۔

۱۹۸۹ء (جولائی) : امریکہ اور کناڈا کا سفر ہوا اور ۲۵ر نومبر کو ہندستان تشریف لائے۔

۱۹۹۰ء (فروری) 'انڈو قطر اُردو سوسائٹی' کی دعوت پر مشاعرے میں شرکت کے لیے قطر تشریف لے گئے۔

۱۹۹۰ء (اکتوبر) : دوسرے مجموعہ غزل 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی' کی تقریبِ اجرا کے موقع پر سعودی تشریف لے گئے۔

۱۹۹۱ء : دوبئ میں 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی...' کی رسم اجراء عمل میں آئی اور اس تقریب میں مجروحؔ سلطانپوری نے بھی شرکت کی اور اپنا مقالہ پڑھا۔

۱۹۹۲ء : خودنوشت ''ابھی سن لو مجھ سے...'' شائع ہوئی۔

: مشی گن اردو سوسائٹی، امریکہ نے انہیں ''علامہ'' کے خطاب سے نوازا۔

: تلسا لٹریری سوسائٹی، اوکلاہوما (Okhalahoma)، امریکہ نے بھی ''علامہ'' کے خطاب سے نوازا۔

: اردو کونسل آف کناڈا، مونٹریال نے توصیفی سند سے نوازا۔

: ریاست اوکلاہوما، امریکہ نے اعزازی شہریت عطا کی۔

۱۹۹۶ء (اکتوبر) : طوبیٰ پبلیکیشنز، حیدرآباد نے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' (طبع سوم) شائع کیا۔

۱۹۹۸ء : 'دیوانے دو' (خطوط کا مجموعہ) اور 'دفتر گم گشتہ' (پی ایچ-ڈی کا مقالہ) شائع ہوئے۔

۲۰۰۱ء : محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار کے ذریعہ ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے کا مولانا مظہر الحق ایوارڈ ملا۔

۲۰۰۲ء (اکتوبر) : نعتوں اور نظموں کے مجموعہ 'کوچہ جاناں جاناں' کی اشاعت عرشی پبلی کیشنز انڈیا، دہلی کے زیر اہتمام ہوا۔

۲۰۰۲ء (۲۲؍جولائی) : اہلیہ کا دورۂ قلب کے سبب انتقال ہوا۔

۲۰۰۳ء 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کا ہندی ایڈیشن کلیم عاجز اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ (یہ اکادمی صرف کاغذ ہی پر رہی)

۲۰۰۴ء : پہلو نہ دُکھے گا... (خطوط کا مجموعہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا۔

پروفیسر محسن عثمانی کی کتاب 'کلیم احمد عاجز: شخصیت اور شاعری'،

: عالمی رابطہ ادب اسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ذریعہ شائع ہوئی۔

'انجم کے نام خطوط' کے مجموعے کی اشاعت۔

: 'انوار العلوم کالج'' کے زیر اہتمام انڈو پاک مشاعرہ میں شرکت۔

: توصیفی سند' اور یادگاریہ (میمنٹو) سے سرفراز۔

۲۰۰۵ء : 'میری زباں میرا قلم' (مضامین کا مجموعہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے دو جلدوں میں شائع کیا۔

۲۰۰۷ء : گورنر راج میں بہار کے گورنر سردار بوٹا سنگھ نے کلیم عاجز کو اردو مشاورتی کمیٹی، بہار کا صدر نشیں بنایا؛ لیکن انہوں نے محکمہ راج بھاشا کو لکھا کہ مجھے جب تک اس کے ساتھ وزیر کی سہولیات نہیں ملیں گی، میں اپنی ذمہ داری نہیں سنبھالوں گا۔

: تنظیم اتحاد المسلمین، پٹنہ کے ذریعہ 'فخر عظیم آباد ایوارڈ'۔

۲۰۰۸ء : 'پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا' (غزلوں اور متفرق کلام کا مجموعہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا۔

: ماہِ مارچ میں رابطہ ادب اسلامی، دہلی کے ذریعہ 'مولانا ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ' سے سرفراز۔

۱۷؍جون کو گورنر راج کے دوران لیے گئے فیصلے کے مطابق نتیش حکومت نے ڈاکٹر کلیم عاجز کو اردو مشاورتی کمیٹی بہار کا صدر نشیں بنایا اور انہیں وزیر کابینہ کی سہولیات بھی دی گئیں۔

۲۰۰۸ء (۲۷؍دسمبر) : American Federation of Muslims of Indian Origin AFMI (USA & Canada) کے ذریعہ شیراٹن ہوٹل، آگرہ (اُتر پردیش) میں منعقدہ ایک پروگرام میں 'میر تقی میر' ایوارڈ اور پچاس ہزار روپے نقد انعام سے نوازے گئے۔

۲۰۱۱ء (۱۷؍جون) : اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے صدر نشیں کی حیثیت سے تین سالہ مدت پوری کی۔

: پٹنہ یونیورسٹی سے .Life Time Achievement Award سے نوازے گئے۔

۲۰۱۲ء (۱۸؍مئی) : دوسری بار اردو مشاورتی کمیٹی، بہار کا صدر نشیں بنایا گیا اور ۲۱؍مئی کو سعودی عرب سے آن لائن جوائننگ دی۔

۲۰۱۲ء (۲۱؍دسمبر) : غالب اکیڈمی، دہلی کی جانب سے ''غالب ایوارڈ'' (for Life Time Achievement Award) سے سرفراز کئے گئے جس میں ایک توصیفی سند، میمنٹو اور پچھتّر ہزار روپے نقد شامل ہیں۔

۲۰۱۳ء (۲۳؍اپریل) : ڈاکٹر ابوالحیات کی پی ایچ-ڈی کی تھیسس 'کلیم عاجز کی نثر نگاری' خدا بخش لائبریری نے شائع کی اور ۲۳؍اپریل کو اس کا اجراء عمل میں آیا۔

۷؍ستمبر ۲۰۱۴ء حمایت نگر، حیدرآباد میں کلیم عاجز کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد اور مقالوں کے مجموعہ بعنوان ''کلیم احمد عاجز'' کا اجراء۔

۱۵؍فروری ۲۰۱۵ء : ہزاری باغ (جھارکھنڈ) میں چھوٹی بیٹی ڈاکٹر شمیمہ کلیم کے گھر پر ۸؍بجے صبح میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہوا۔

۱۶؍فروری ۲۰۱۵ء : ۱۰:۲۰؍بجے دن میں پٹنہ کے گاندھی میدان میں نمازِ جنازہ امیرِ شریعت، امارت شرعیہ، پٹنہ، حضرت مولانا نظام الدین صاحب نے پڑھائی اور سمن پورہ (راجا بازار)، پٹنہ کے قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین ہوئی۔

ابتدائی زندگی

ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ کی پیدائش پٹنہ ضلع کی ایک مشہور بستی تیلہاڑا میں ۹/اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شیخ کفایت حسین اور والدہ کا نام امت الفاطمہ تھا۔ آپ کی پرورش و پرداخت آپ کی نانیہال؛ یعنی تیلہاڑا میں ہی ہوئی؛ کیوں کہ آپ کے والد صاحب اپنی سسرال ہی میں بس گئے تھے۔ آپ کی دادیہال تیلہاڑا سے دو میل دور 'کنہیا گنج' ہے۔

کلیم عاجزؔ کے بچپن کا نام کلّو تھا۔ لوگ آپ کو پیار سے کلیم کی بجائے 'کلوا' کہا کرتے تھے۔ آپ کو بڑے لاڈ و پیار سے پالا گیا؛ اس لیے لگ بھگ چھ ساڑھے چھ سال تک پڑھائی لکھائی کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ آپ کا زیادہ تر وقت کھیل کود میں گذرتا۔ آپ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کبڈّی کھیلتے، پتنگ اُڑاتے، جھولا جھولتے، ان کھیلوں میں انہیں بڑا لطف ملتا۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی وہ گھر میں چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ ستون کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیل کر اپنا دل بہلاتے۔

کلیم عاجزؔ کو بچپن ہی سے قصے اور کہانیوں کا شوق رہا ہے اور اس شوق کو اُبھارنے میں ان کی بڑی بہن محمودہ خاتون کا بڑا ہاتھ ہے، جو انہیں نذیر احمد اور دوسرے ناول نگاروں کے قصے پڑھ کر سنایا کرتی تھیں اور کلیم عاجزؔ کو خود بھی پڑھنے کے لیے کہا کرتیں۔ اس طریقے سے کلیم عاجزؔ کو قصے اور کہانیوں سے خاص دلچسپی ہوگئی اور وہ بہت کم عمری میں بڑی تیز رفتاری سے بہت ساری مشہور

کہانیوں اور طویل قصوں و ناولوں کو پڑھ گئے۔ اس سلسلے میں انہیں اس لیے بھی اور سہولت مل گئی کہ ان کے یہاں قصے اور کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جو صندوق میں بند رہتا تھا۔ شررؔ اور نذیرؔ کے ناول تو اس زمانے میں ہر گھر میں رکھنے اور پڑھنے کا رواج تھا۔

الغرض کتابوں کی دستیابی اور کہانی قصوں سے دلچسپی کے سبب کلیم عاجزؔ بہت کم عمری اور کم وقفے میں لگ بھگ سبھی مشہور ناول، قصے اور کہانی مثلاً: قصص الانبیاء، مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، قصہ حاتم طائی، آرائش محفل، باغ و بہار، طلسم ہوش رُبا (تین جلدیں)، بہار کا مشہور ناول 'فسانۂ خورشیدی' اور شررؔ کے سبھی مشہور ناول پڑھ، یا سن چکے تھے۔

الف لیلیٰ میں خلیفہ ہارون رشید کی ڈاکوؤں کے ساتھ مقابلہ آرائی والا قصہ انہیں بہت پسند آیا؛ اس لیے انہوں نے ایک بار اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس واقعے کی ڈرامائی نقل کی، اس میں وہ خود خلیفہ ہارون رشید بنے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک مصرعہ کہا، جسے وہ ڈاکوؤں پر حملہ کرتے وقت زور و شور سے پڑھا کرتے تھے۔

شاہ ہوں بغداد کا ہاروں رشیدا نام ہے

درج بالا مصرع میں 'ہارون رشید' کی بجائے 'ہاروں رشیدا' استعمال کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ابتدا ہی سے، وہ موزوں طبع تھے اور ان کے اندر شاعرانہ صلاحیت موجود تھی۔

کلیم عاجزؔ کے والد کلکتہ میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ انہوں نے نو سال کی عمر میں کلیم عاجزؔ کو اپنے پاس بلوالیا۔ انہیں تعلیم سے زیادہ تندرستی کا خیال رہتا تھا؛ اس لیے انہوں نے کلیم عاجزؔ کو اپنے جان پہچان کے دو پہلوانوں نوابؔ پہلوان اور فیروزؔ پہلوان کے حوالے کیا، جو انہیں روزانہ اکھاڑے میں زور کرایا کرتے تھے، روزانہ کی ورزش اور کشتی سے کلیم عاجزؔ کا جسم کافی نکل آیا اور بدن میں کافی قوت اور چستی پیدا ہوگئی، چوں کہ وہ روزانہ کشتی لڑتے اور زور کیا کرتے؛ اس لیے ان کے والد دودھ، گھی اور میوے وغیرہ ہر وقت گھر میں موجود رکھتے اور کلیم عاجزؔ کو کھانے کی تاکید کرتے؛ لیکن کلیم عاجزؔ کو ان چیزوں سے کوئی رغبت نہیں تھی؛ اس لیے انہیں برابر نظر بچا کر گرا دیتے، پھینک دیتے، یا کہیں چھپا دیتے۔ ان باتوں کی خبر اگر ان کے والد صاحب کو ہو جاتی تو ان کی بڑی زوردار پٹائی کرتے۔

کلیم عاجزؔ کو اپنی نانیہال اپنی ماں اور اپنے بھائی بہنوں سے بڑی شدید محبت تھی۔ ان لوگوں سے جدائی کا تصور ان کے لیے بڑا جان لیوا تھا؛ اس لیے گھر سے جب بھی کلکتہ، یا پٹنہ کے لیے روانہ

ہوتے، ہفتوں پہلے سے ان پر ایک ہول طاری رہتا۔ کبھی کبھی بخار بھی آجاتا، یا دست ہونے لگتا۔ جاتے وقت آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب کلیم عاجزؔ کے کلکتہ جانے کا دن قریب آیا تو ان کی حالت پھر غیر ہونے لگی۔ تیلہاڑا سے جدائی کا جان لیوا تصور انہیں پریشان کرنے لگا اور انہوں نے بار بار کی اس مصیبت سے بچنے کے لیے ایک ترکیب یہ سوچی کہ زیادہ مقدار میں جمال گوٹہ کھا کر جان دے دی جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے بنئے کی دُکان سے جمال گوٹہ اور چھوٹی الائچی خریدی، چھوٹی الائچی خریدنے میں یہ مصلحت تھی کہ دکاندار ان پر شک نہ کرے اور یہ سمجھے کہ دوا کے لیے جمال گوٹہ خریدا جارہا ہے۔ انہوں نے راستہ میں اسے پتھر سے کچل کر اس کی شکل بدل دی اور ایک حلوائی کی دکان پر جاکر اسے کھوئے کا پیڑا بنانے کو کہا اور ساتھ ہی جمال گوٹہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میوے کو پیڑے میں ڈال دو۔ اتفاق سے بنیا اس طرف سے گزرا، انہیں حلوائی کی دکان پر بیٹھا دیکھ کر اس کو کچھ شک ہوا، اس نے ان کے نانا سے جاکر پوچھا کہ 'آپ نے کلیم بابو کی معرفت ایک تولہ جمال گوٹہ منگوایا ہے؟' نانا جان کو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ فوراً حلوائی کی دُکان کی طرف لپکے، اس اثنا میں پیڑے تیار ہو چکے تھے اور کلیم عاجزؔ اسے لے کر چلنے ہی والے تھے کہ نانا جان آدھمکے اور ان کے ہاتھ سے پیڑے لے لیے۔ پیڑے نرم تھے؛ اس لیے ایک پیڑے کا چوتھائی حصہ ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ نانا جان نے سمجھا کہ کلیم عاجزؔ پیڑے کھا چکے ہیں۔ انہیں سمجھا بجھا کر گھر لائے۔ ڈاکٹر آئے، دوا دی گئی اور کلیم عاجزؔ بناوٹ میں بار بار بیت الخلاء جاتے رہے۔

کلیم عاجزؔ کے رشتہ کے خالو قاضی نصیر الدین صاحب جو ہلسہ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں قیام کرتے تھے، انہیں ساتھ لے جانے کے لیے ہلسہ سے آئے تھے۔ نانا جان نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر روانہ کر دیا اور کہہ دیا کہ 'کلیم کلکتہ نہیں جائے گا'۔ اس طرح کلیم عاجزؔ کے سر سے یہ مصیبت کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی۔

اسی طرح ایک بار انہیں رشتے کے ایک بھائی فرید الحق کے ساتھ کلکتہ روانہ کیا گیا۔ دونوں تیلہاڑا سے چھوٹی لائن کی گاڑی پر سوار ہوئے، گاڑی فتوحہ اسٹیشن پر رُکی۔ دونوں گاڑی سے اُتر کر بڑی لائن کے پلیٹ فارم پر آئے اور پھر بڑی لائن کی گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے ہی کلیم عاجزؔ انگلی چھڑا کر بھاگ نکلے اور ایک مقام پر جلے ہوئے کوئلے کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے اور تیز کڑاکے کی سردی میں ساری رات اسی ڈھیر کے پیچھے چھپے رہے۔ فرید الحق انہیں کونہ کونہ ڈھونڈتے رہے اور پھر تھک کر تیلھاڑا

واپس ہو گئے اور یہ دوسرے دن چار بجے صبح میں باہر نکلے اور ایک شخص سے کہا کہ مجھے باڑھ کا ٹکٹ دلا کر باڑھ کی گاڑی پر بیٹھا دیجئے۔ اور اس طرح وہ کلکتہ جانے کی بجائے اپنی باجی کے یہاں باڑھ چلے گئے۔

کلیم عاجزؔ کے بڑے نانا مولوی امیر الدین بھی کلکتہ میں رہتے تھے اور لاولد ہونے کی وجہ سے ان کے والد صاحب کے کاروبار کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ان کی صحبت میں کلیم عاجزؔ کے ادبی ذوق کو کافی جلا ملی، یہاں انہوں نے طلسم ہوش ربا کی بقیہ جلدیں خرید کر پڑھیں؛ پھر 'الف لیلیٰ'، 'داستان میر حمزہ' وغیرہ پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد رسالوں کا شوق پیدا ہوا، لہٰذا اس زمانے کے تمام مشہور رسالے 'عالمگیر' (لاہور)، 'نیرنگ خیال' (لاہور)، 'ہمایوں'، 'ساقی'، 'ادبی دنیا'، 'کلیم' اور 'رومان' ان کے مطالعے میں رہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے اس زمانے میں لکھنؤ اسکول کے تمام مشہور شعراء مصحفیؔ، انشاؔ، ناسخؔ، رندؔ، صباؔ، وزیرؔ اور داغؔ وامیرؔ کے دواوین پڑھ ڈالے۔

غرض ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ کلیم عاجزؔ کے زبردست مطالعہ کا زمانہ ہے۔ وہ خود اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک تین سال میں دس سے تیرہ سال کی عمر تک صبح اُٹھنے سے رات گیارہ بجے تک مستقل چھپ چھپ کر میں مطالعہ ہی میں مشغول رہتا"۔

("وہ جو شاعری کا سبب ہوا......"، ص: ۵۲)

کلیم عاجزؔ کی اس کثرت کتب بینی کا ایک سبب تو ان کا ادبی ذوق تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ تیلہاڑا کی جدائی سے ان کے دل پر ایک عجیب کیفیت گزرتی، لہٰذا وہ اس غم کو ختم، یا کم کرنے کی غرض سے خود کو کہانیوں اور رسالوں میں گم کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔

کلکتہ میں رہ کر کلیم عاجزؔ کو دو چیزوں سے خاص طور پر رغبت ہوئی۔ ایک تو یہی مطالعہ دوسرے تھیٹر بینی وسنیما بینی۔ خود لکھتے ہیں:

"کلکتہ کے قیام، گھر کی دوری اور والد صاحب کی سخت اُصول پرستی نے ردّعمل کے طور پر مجھ میں دو چیزیں پیدا کر دیں: مطالعہ اور تماش بینی"۔

("وہ جو شاعری کا سبب ہوا......")

تھیٹر بینی کی ابتدا ملازم اور دوستوں کے رغبت دلانے سے ہوئی اور پھر تھیٹر بینی کا یہ شوق جنون کی حد کو پار کر گیا۔ تھیٹر کی پابند بینی کے سبب بہت سے ایکٹر اور دربان انہیں پہچان گئے اور ان سے محبت

کرنے لگے۔ان میں سے اکثر انہیں تھیٹر بینی سے منع کرتے۔ایک بار جب وہ تھیٹر دیکھنے گئے تو عامل خان نامی ایک دربان نے انہیں ٹکٹ لینے سے روکا اور انہیں کھڑا رہنے کو کہا۔وہ یہ سمجھے کہ انہیں بے ٹکٹ داخل کردیں گے،جب تماشا شروع ہوگیا اور سب تماشائی ہال کے اندر چلے گئے تو وہ انہیں سائکل پر آگے بیٹھاتا ہوا بولا،آؤ آج میں تمہیں ایک تماشا دکھاؤں،پھر انہیں کھلی اور سنّاٹی سڑک پر لا کر طمانچوں سے پیٹنا شروع کردیا کہ نالائق،کمینہ،روز منع کرتا ہوں؛مگر مانتا ہی نہیں۔ٹھیک سے پیٹنے کے بعد پھر انہیں سائیکل پر بیٹھا کر ان کے گھر لے آیا اور دروازے پر آواز دی۔ان کے والد صاحب باہر نکلے تو کلیم عاجز کو ان کے حوالے کرتے ہوئے بولا کہ'روزانہ تھیٹر چلا جاتا ہے،منع کرتا ہوں؛مگر مانتا نہیں'۔والد صاحب خاموشی سے انہیں اندر لے گئے۔صبح ہوتے پر انہیں طلب کیا اور دونوں ہاتھ پاؤں باندھ کر طمانچوں اور لاتوں سے اچھی خاصی پٹائی کی۔انہیں کلیم عاجز کی تھیٹر بینی کی خبر نہ تھی؛کیوں کہ کلیم عاجز رات میں اپنے بستر پر تکیہ سجا کر چادر سے ڈھک دیا کرتے تھے،جب وہ ان کی اچھی طرح مرمت کرچکے تو کہا،'میاں کلیم!میرے اور بھی بچے ہیں،میں اپنا پیسہ،اپنی کمائی یوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا'۔

کلیم عاجز کو اپنے والد صاحب کی یہ بات بُری لگی اور وہ گھر سے نکل گئے اور لگ بھگ تین مہینے ستو کھا کر اپنے دوستوں کے یہاں چھپتے پھرے۔اس درمیان ان کی اماں کا بھیجا ہوا ایک آدمی ان کے بازو پر ایک تعویز باندھ گیا اور کہہ گیا کہ سخت مصیبت کی گھڑی میں کھولنا۔اس تین مہینے کے عرصے میں ان کے والد ان کے حالات سے واقف رہے اور مختلف طریقے سے ان کی مدد کی کوشش کرتے رہے؛لیکن سزا کے طور پر انہیں واپس گھر نہیں بلایا۔تین مہینے کے بعد جب ان کے پیسے قریب قریب ختم ہوگئے تو وہ حالات سے گھبرا کر خودکشی کے لیے تیار ہوگئے اور ہوڑہ پُل سے کود کر جان دینے کا مصمّم ارادہ کرلیا؛لیکن اس درمیان انہیں اپنی ماں کا بھیجا ہوا تعویذ یاد آگیا۔سوچا کہ اس سے زیادہ مصیبت کی گھڑی اور کون ہوسکتی ہے۔یہ سوچ کر انہوں نے تعویذ کھولا۔اندر سے سو روپئے کا ایک نوٹ نکلا۔نوٹ دیکھتے ہی خودکشی کا سارا منصوبہ پس پشت چلا گیا اور لذیذ کھانے،گرم جلیبی اور مزیدار حلوے یاد آنے لگے۔المختصر کلیم عاجز روپئے کے ملنے کے بعد کلکتہ سے روانہ ہوگئے اور تیلہاڑا چلے آئے۔

کلیم عاجز کی تھیٹر بینی کا یہ شوق ساری زندگی رہا؛لیکن اب اس نے اپنی شکل بدل لی ہے؛ یعنی وہ سنیما بینی میں تبدیل ہوگئی ہے۔مجھے اس بات کا علم اس وقت ہوا،جب میری ان سے صبح و شام کی مصاحبت رہنے لگی۔وہ اکثر ہر صبح تمام معمولات سے فارغ ہوکر تقریباً ۱۱ر بجے دن میں

اندرونِ خانہ اپنے علاحدہ کمرے میں بیٹھ کر فلمیں دیکھا کرتے ہیں،جن میں اکثر فلمیں انگریزی ہوا کرتی ہیں،ان کا تقریباً روزانہ یہی معمول مغرب کی نماز کے بعد بھی رہتا ہے۔

تعلیمی زندگی

کلیم عاجز کی پرورش بڑے لاڈ و پیار سے ہوئی تھی؛اس لیے ان کی پڑھائی لکھائی کا سلسلہ بہت دیر سے شروع ہوا۔عموماً چار ساڑھے چار سال کی عمر میں بچوں کو مکتب میں بیٹھا دیا جاتا تھا؛لیکن جب یہ چھ ساڑھے چھ سال کے ہوگئے تو لوگوں کو آپ کی تعلیم کا خیال آیا،لہٰذا انہیں ان کے نانا مولوی ضمیر الدین کے مکتب میں بیٹھایا گیا،جو کہ گھر ہی میں تھا۔اس مکتب میں ہندو اور مسلمان شرفا کے لڑکے مفت تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔کلیم عاجز بہت ہی ذہین تھے،لہٰذا بڑی تیزی کے ساتھ کتابوں کو ختم کرتے چلے گئے۔وہ خود بھی فرماتے ہیں:

"میرا حافظہ عجیب وغریب تھا۔کسی سبق کو دوبارہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

("وہ جو شاعری کا سبب ہوا.....")

قاعدہ بغدادی ختم کرکے انہوں نے'پارہ عم،اردو کی ابتدائی کتابیں،آمدنامہ،نسخۂ تعلیمیہ،رقعاتِ عزیزی،گلستاں،بوستاں اور یوسف زلیخا'وغیرہ کتابیں صرف دو سال کے عرصے میں ختم کردیں،ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے بہت سارے مشہور ناول،قصے اور کہانیاں بھی پڑھ ڈالیں۔

نو برس کی عمر میں ان کے والد صاحب نے انہیں کلکتہ بلایا؛تاکہ وہ اپنی مزید پڑھائی جاری رکھ سکیں۔یہاں انہیں لگ بھگ دو سالوں تک ایک پرائیوٹ ٹیوٹر رکھ کر انگریزی اور حساب کی تعلیم دلوائی گئی۔ان کے استاد تر پاٹھی جی بڑے وضع دار اور نستعلیق قسم کے انسان تھے۔دو سال ٹیوشن پڑھنے کے بعد کلکتہ کے ایک اسکول کی چھٹی،یا پانچویں جماعت میں ان کا داخلہ کرایا گیا؛لیکن تھیٹر بینی کی وجہ سے جب ان کے والد صاحب نے ناراض ہوکر مارا پیٹا تو کلیم عاجز بھاگ کر تیلہاڑا چلے آئے۔اس طرح ان کی پڑھائی لکھائی کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے منقطع ہوگیا؛لیکن ان کی والدہ نے انہیں سمجھایا بجھایا اور دوبارہ پڑھائی لکھائی کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے رضامند کرکے ایک نوکر جمعراتی کے ساتھ پٹنہ روانہ کیا۔وہ پٹنہ میں لیلیٰ کالج میں کمرہ لے کر رہنے لگے۔جمعراتی ان کا کھانا بنایا کرتا اور وہ پرائیوٹ ٹیوشن پڑھا کرتے،پھر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پٹنہ مسلم ہائی اسکول کے نویں درجہ میں کچھ تاخیر سے داخلہ بھی لے لیا۔

اسکول میں آپ عموماً سب سے الگ تھلگ رہتے اور سب سے پیچھے بیٹھتے؛ تاکہ ماسٹر صاحب کی نظر ان پر نہ پڑے۔ ان کے تین ہم جماعت نظیر حیدر، صلاح الدین اور مہدی ذہین اور اسکول میں مشہور تھے۔ ششماہی امتحان ہوا تو نظیر حیدر نے فرسٹ، صلاح الدین نے سیکنڈ اور کلیم عاجزؔ نے تھرڈ پوزیشن حاصل کی۔ نوماہی امتحان میں نظیر حیدر فرسٹ، کلیم عاجزؔ سیکنڈ اور صلاح الدین تھرڈ ہوئے اور سالانہ امتحان میں کلیم عاجزؔ نے فرسٹ اور نظیر حیدر نے سیکنڈ اور صلاح الدین نے تھرڈ پوزیشن حاصل کی۔ اس کامیابی کی وجہ سے انہیں دوہری ترقی دی گئی اور ان کا داخلہ گیارہویں جماعت؛ یعنی میٹرک میں ہو گیا۔

۱۹۴۱ء میں کلیم عاجزؔ نے میٹرک کا امتحان دیا اور اس میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ آپ کا مقام اسکول میں اوّل اور پورے صوبے میں پانچواں تھا۔ اس کامیابی پر آپ کو ایک نقرئی تمغہ (سلور میڈل) بھی عطا کیا گیا۔

اس کے بعد کلیم عاجزؔ نے پٹنہ کالج میں آئی.اے میں داخلہ لیا؛ لیکن اس بیچ آپ کے بڑے بھائی سلیم احمد کو دق کی بیماری نے زور پکڑا۔ آپ گھر آ گئے، بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد بڑی بہن محمودہ خاتون عرف منگتو بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور پھر کچھ ہی عرصے بعد والد صاحب بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اس کے بعد چھوٹے بھائی علیم احمد بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور پھر چند مہینوں بعد فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا، اس فساد کی لہر کلیم عاجزؔ کے گاؤں تیلہاڑا تک بھی پہنچی اور ٹھیک بقرعید کے روز ۳؍نومبر ۱۹۴۶ء کو پوری بستی کے مسلمان مرد اور عورت بڑی بے دردی سے شہید کر دیئے گئے، جن میں کلیم عاجزؔ کی والدہ ماجدہ اور چھوٹی بہن رشیدہ بھی شامل تھیں، ان کے علاوہ کلیم عاجزؔ کے اور بھی نزدیکی رشتہ دار شہید کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کا کلیم عاجزؔ پر بڑا گہرا اور مستقل اثر پڑا اور انہیں ایک غیر فانی متاعِ غم حاصل ہو گیا، اس غم کی آگ میں وہ اس وقت سے اب تک مسلسل جل رہے ہیں۔ ان حادثات کی وجہ سے اس درمیان کلیم عاجزؔ کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میٹرک کے امتحان کے بعد جب کلیم عاجزؔ کلکتہ لوٹے تھے تو انہوں نے اس درمیان واجد علی نامی ایک شخص کی رغبت اور غیرت دلانے پر بہت ہی کم وقت میں بنگلہ پڑھنا، لکھنا اور بولنا سیکھ لیا تھا اور کسی قدر مہارت بھی حاصل کر لی تھی اور اس طرح پڑوس کے ایک اخبار فروش پنڈت جی سے ہندی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ یہ دونوں زبانیں انہوں نے صرف ایک سال کے عرصہ میں سیکھیں، کیوں کہ ۱۹۴۲ء کے بعد ان کا کلکتہ کا قیام ملتوی ہو گیا۔

۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد وہ مستقل طور سے پٹنہ میں سکونت پذیر ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں اپنا کپڑے کا کاروبار بھی شروع کر دیا، ایک دن ان کے چچیا سسر سید احسن الظفر (سابق میئر، پٹنہ) نے دکان پر آ کر ان سے کہا: 'دیکھو کلیم! میں نے بی.اے کر لیا نا'۔ ان کی یہ بات سن کر کلیم عاجزؔ نے جواب دیا: 'یہ کون سی بڑی بات ہے، میں بھی پاس کر کے دکھا دیتا ہوں'۔

اس کے بعد کلیم عاجزؔ نے بہار یونیورسٹی سے اجازت لے کر پرائیوٹ آئی.اے کا امتحان دیا اور ۱۹۵۴ء میں سیکنڈ ڈویژن سے آئی.اے پاس کر لیا، پھر بی-این کالج میں بی.اے (اُردو آنرس) میں داخلہ لیا اور بی.اے کے امتحان میں پوری یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا۔ کلیم عاجزؔ کی اس کامیابی سے بی-این کالج کو پہلی بار یہ فخر حاصل ہوا کہ اس کالج کے ایک طالب علم نے یونیورسٹی میں اول مقام حاصل کیا، اس شاندار کامیابی پر کلیم عاجزؔ کو طلائی تمغہ (گولڈ میڈل) سے سرفراز کیا گیا۔

اس کے بعد آپ نے یونیورسٹی میں ایم.اے اُردو میں داخلہ لیا اور اس میں بھی اوّل مقام حاصل کر کے طلائی تمغہ کے حق دار بنے۔

ایم.اے کرنے کے لگ بھگ سات برس کے بعد ۱۹۶۵ء میں آپ نے پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔

عملی زندگی

فرقہ وارانہ فساد سے لگ بھگ ایک سال قبل آپ کی والدہ نے ضد کر کے آپ کی شادی کر دی۔ آپ کی شادی لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی کے ایک مشہور رئیس شیخ کنواں (مشہور تھا کہ وہ اپنی دولت کنوئیں میں رکھتے ہیں) کی پوتی انوار فاطمہ عرف شرفا سے ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔

جس زمانے میں کلیم عاجزؔ پٹنہ مسلم ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور لیلیٰ کاٹج میں مقیم تھے، ان کے بڑے سالے سید ظہیر احسن اپنی پھوپھی (فضل حق آزاد کی بہو) سے ملنے لیلیٰ کاٹج کے سامنے والے گھر میں آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کے ڈیرے بھی چلے آتے۔ کلیم عاجزؔ کے یہاں ان کی آمد و رفت کی وجہ یہ تھی کہ کلیم عاجزؔ کے ایک دوست مُدّن، لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی میں رہا کرتے تھے، جن سے ظہیر احسن کی اچھی جان پہچان تھی؛ اس لیے جب وہ اپنی پھوپھی کے یہاں آتے تو کلیم عاجزؔ سے بھی ملنے چلے آتے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات بڑھتے گئے اور پھر ۱۹۴۲ء میں سید ظہیر احسن، کلیم عاجزؔ سے اپنی

بہن انوار فاطمہ کا رشتہ طے کرنے کے لیے تیلہاڑا گئے، جب کلیم عاجزؔ کی والدہ صاحبہ کے سامنے یہ بات رکھی گئی تو انہوں نے رضامندی کا اظہار کیا اور پھر لگ بھگ تین سالوں کے بعد ۱۹۴۵ء میں انوار فاطمہ بنت سید احسن حسین سے کلیم عاجزؔ کا نکاح کر دیا گیا، جن سے ان کو چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

کاروبار کے ساتھ ساتھ آپ تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی میں لکچرشپ حاصل کی اور ایک سال تک وہاں لکچر رہے۔ اسی بیچ آپ نے ۱۹۶۵ء میں پی. ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کر لی اور پٹنہ یونیورسٹی میں لکچرشپ کے لیے درخواست دی، پھر مسابقتی امتحان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی، لہٰذا ۱۹۶۵ء میں آپ کو پٹنہ کالج (پٹنہ یونیورسٹی) میں لکچرشپ حاصل ہو گئی اور اس وقت سے لے کر اکتوبر ۱۹۸۴ء تک آپ پٹنہ کالج کے شعبہ اُردو میں اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ خود مجھے بھی لگ بھگ دو سالوں تک ان کے قریب رہنے کا شرف حاصل رہا؛ کیوں کہ وہ بہار اسکول پڑھانے کے لیے ہفتہ میں ایک بار ایم.اے کا کلاس لینے ہمارے شعبے میں تشریف لاتے ہیں، چوں کہ میرا موضوع بہار اسکول نہیں تھا، پھر بھی میں کبھی کبھی ان کی کلاس میں بیٹھ جایا کرتا تھا۔ بحیثیت استاد، کلیم عاجزؔ ایک شفیق، خوش مزاج اور اعلیٰ درجے کے انسان رہے، وہ اپنے منصب اور فرائض کو خوب اچھی طرح سمجھتے۔ ان کے لکچروں کے بارے میں عام طور سے یہ خیال تھا کہ ان میں دلکشی تو ہوتی ہے؛ لیکن قطعیت نہیں ہوتی۔ پھیلاؤ تو ہوتا ہے؛ لیکن گہرائی نہیں ہوتی۔ ان میں شاعرانہ رنگ، رعنائی خیال اور مرادفات کی کثرت تو ہوتی ہے؛ لیکن منطقی اور سائنسی ربط نہیں ہوتا؛ لیکن بہرحال اتنی بات ضرور تھی کہ ان کے لکچرس دوسرے اساتذہ سے مختلف اور منفرد ہوتے تھے، جب وہ کسی موضوع کو اُٹھاتے ہیں تو بے تکان بولے جاتے ہیں، جس کو سننے سے تھکاوٹ، یا بدمزگی کا احساس نہیں ہونے پاتا ہے۔ الفاظ اتنے میٹھے، خوبصورت اور دلنشیں ہوتے کہ کانوں میں رس گھولنے لگتے۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد کلیم عاجزؔ عموماً اپنی دکان پر بیٹھتے تھے۔ ان کی یہ دکان ان کی نشست گاہ بھی تھی، جہاں وہ اپنے ملاقاتیوں سے ملتے جلتے ہیں اور طالب علموں کی مختلف قسم کی دشواریوں کو بھی دُور کرتے ہیں۔ آپ بڑے شیریں کلام اور نرم گفتار ہیں۔ کبھی اونچی آواز، یا تلخ لہجے میں گفتگو نہیں کرتے۔ خوش پوشی، خوش کلامی، خوش اخلاقی اور نفاست آپ کی سرشت میں داخل ہے؛ لیکن جب ناراض ہوتے ہیں تو شدت اختیار کر لیتے ہیں۔

کلیم عاجزؔ ایک دیندار اور صوفی منش انسان ہیں۔ اسلام کی ایک سرگرم تنظیم 'تبلیغی جماعت' سے ان کا باضابطہ تعلق ہے۔ آپ ۱۹۶۱ء ہی سے اس تنظیم سے منسلک ہیں، لہٰذا وہ کالج اور دکان (اب دوکان ختم ہو چکی ہے) کے علاوہ اپنا خاصا وقت اعلاءِ کلمۃ الحق اور دین کی تبلیغ و اشاعت کی کوششوں میں صرف کرتے ہیں اور اس سلسلے میں برابر دَورے کیا کرتے ہیں، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور صوفیانہ مزاج کی وجہ سے ایک کثیر تعداد ان کی عقیدت مند ہے۔ وہ ہر کس و ناکس کے ساتھ بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں؛ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تبلیغی سرگرمیوں کے نام پر اکثر ان کا طویل اور مختصر وقفے کے لیے بغیر کسی چھٹی کے کالج سے غائب رہنا ان کی شخصیت پر سوالیہ نشان لگاتا تھا اور اساتذہ و شاگردان میں موضوعِ بحث بنا رہتا تھا۔

بہرحال چوں کہ کلیم عاجزؔ کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت کا سکہ کالج کے طالب علمی سے قبل ہی منوا چکے ہیں؛ اس لیے انہیں وقتاً فوقتاً مشاعرے میں بھی شرکت کی دعوت ملتی ہے اور اس سلسلے میں انہیں ہندوستان کے علاوہ جدّہ، پاکستان، امریکہ، کناڈا، دوبئ، ابوظہبی وغیرہ کے مشاعروں میں بھی شامل ہونے کے مواقع ملے ہیں۔

کلیم عاجزؔ صرف ایک خوش فکر اور خوش گلو شاعر ہی نہیں؛ بلکہ اعلیٰ پایہ کے صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثروں میں بلا کا حسن اور غضب کی دلکشی ہے۔ ان کی باتیں دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہیں اور دل کی گہرائیوں میں جا بیٹھتی ہیں۔ مختلف شخصیتوں کے مرقعے پیش کرنے، مختلف کیفیات و حالات کی تصویر کشی کرنے اور کسی ماحول یا منظر کو ہمارے سامنے زندہ کر دینے میں انہیں بے مثال مہارت حاصل ہے اور وہ اس معاملے میں محمد حسین آزادؔ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ کلیم عاجزؔ کی نثر نگاری کا یہ بھی کمال ہے کہ ان میں عام بول چال کے الفاظ اس برجستگی اور خوبصورتی کے ساتھ لائے جاتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا مطلق احساس نہیں ہوتا کہ یہ ادبی الفاظ نہیں، بالکل عام بول چال کے الفاظ ہیں۔

مختصراً کلیم عاجزؔ ایک بلند پایہ شاعر، صاحبِ طرز نثر نگار، شفیق استاد، ایماندار تاجر، سرگرم مبلّغ اور ایک پرکشش انسان ہیں۔

شاعری کی ابتدا

کلیم عاجزؔ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہاں شعروشاعری کا چرچہ تھا۔تیلہاڑا کی سادہ دیہاتی فضا میں بھی شعروشاعری کے دلدادہ افراد کی کمی نہ تھی۔خود ان کے نانا جان ایک موزوں طبع عالم تھے۔عبدالصمد طپشؔ، عبدالحمید حمیدؔ وغیرہ شعراء وہاں موجود تھے۔کلیم عاجزؔ کہتے ہیں کہ محلے کے چمرو نانا نے تیلہاڑا میں پہلی مرتبہ ڈاک خانہ قائم ہونے پر یہ شعر کہا تھا، جو زباں زد خاص و عام ہو گیا تھا ۔

یکُم فروری روزِ منگل شُدی
کھلا ڈاکخانہ تلہاڑا میں جی

ان کے علاوہ ''دیوانِ غالبؔ'' کے حافظ، عبدالحفیظ صاحب کی شخصیت ایک انجمن سے کم نہ تھی۔ان کی نشست گاہ میں اکثر شعری مجلسیں ہوا کرتیں، جس میں مولانا عبدالصمد طپشؔ، شاہ عبدالحمید حمیدؔ اور عبدالحفیظ وغیرہ بیٹھ کر فکرِ شعر اور ذکرِ شعر کیا کرتے۔کلیم عاجزؔ خود کہتے ہیں:

''بھائی عبدالحفیظ کی ذات ایک انجمن تھی اور ان کی نشست گاہ ایک سماجی ادارہ .... شعروادب کا بڑا ستھرا مذاق.... ہر دو چار روز پر کسی شاعر کا دیوان ذاتی کتب خانہ سے نکلوایا جاتا۔معین الدین حیدر صاحب، ماسٹر یعقوب صاحب، مولانا عبدالصمد

طپشؔ، شاہ عبدالحمید حمیدؔ اور بھائی ظفر امام صاحب کے درمیان ایک ایک شعر پڑھا جاتا اور اس کے معنی ومفہوم اور اسلوب پر خیال آرائی ہوتی''۔

(''وہ جو شاعری کا سبب ہوا......'')

ان سب کے علاوہ تیلہاڑا میں مشاعرہ بھی ہوا کرتا اور اس میں مقامی وغیر مقامی شعرا شریک ہوتے۔کلیم عاجزؔ لکھتے ہیں:

''دوبار میری یاد میں شعروسخن کی محفل جمی''۔

(''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی...'')

غرض تیلہاڑا کے سادہ دیہاتی ماحول میں شعروشاعری کا چرچہ تھا اور پڑھے لکھے تمام افراد کو اس سے کچھ نہ کچھ دلچسپی تھی۔

پھر جب وہ نو سال کی عمر میں کلکتہ پہنچے تو وہاں کی فضا بھی شعری وادبی تھی۔وحشتؔ کلکتوی اور منشی آرزوؔ لکھنوی کے شاگردان کلکتہ کی سرزمین پر شعروشاعری کی محفلیں گرم کئے ہوئے تھے۔ان کے علاوہ پرویزؔ شاہدی، ہدہدؔ عظیم آبادی، محمود طرازیؔ، مسعود صابریؔ، ظفر تبریزیؔ، اور عنایتؔ دہلوی کے نغموں سے کلکتہ کی فضا گونج رہی تھی، لہٰذا کلیم عاجزؔ فرماتے ہیں:

''۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء، تین سال کلکتہ کی ادبی اور شاعرانہ فضا سے قربت اور ہم آہنگی کا دَور ہے''۔

(''وہ جو شاعری کا سبب ہوا......'')

اس زمانے میں کلیم عاجزؔ نے دبستانِ لکھنؤ کے لگ بھگ تمام مشہور شعرا مصحفیؔ، انشاؔء، ناسخؔ، رندؔ، صباؔ، وزیرؔ، داغؔ اور میرؔ کے دواوین پڑھ ڈالے۔اس سے ان کے اندر شعروشاعری کا کافی نکھرا، ذوق اور شوق پیدا ہو گیا۔

دوسرے انہوں نے کلکتہ میں رہ کر کافی تھیٹریکل ڈرامے دیکھے۔ان تھیٹروں کی ادبی اور شاعرانہ فضا نے بھی کلیم عاجزؔ کے شعری وادبی ذوق کو کافی جِلا دی۔کلیم عاجزؔ کا کہنا ہے کہ:

''مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کہ ادب اور شاعری کے ذوق کا بہت بڑا حصہ مجھے تھیٹریکل ڈراموں سے ملا''۔

(''وہ جو شاعری کا سبب ہوا......'')

غرض ان ہی ماحول اور حالات کے زیر اثر کلیم عاجزؔ کی ادبی شخصیت کی تعمیر شروع ہوئی اور ان کا ادبی وشعری ذوق دھیرے دھیرے پروان چڑھنے لگا اور ان کی طبیعت میں موزونی آتی گئی۔

ڈاکٹر کلیم عاجزؔ نے اپنی باضابطہ شاعری کا آغاز اگرچہ بہت بعد میں کیا؛ لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا کہ ان کی طبیعت میں موزونی ابتدا ہی سے تھی، جس وقت وہ سات سال کے تھے، انہوں نے 'الف لیلیٰ' میں خلیفہ ہارون رشید کا قصہ پڑھا۔ اس کا ایک واقعہ انہیں بہت پسند آیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی ڈرامائی نقل کی، اس زمانے میں کلیم عاجزؔ نے ایک مصرع کہا تھا۔ ع

شاہ ہوں بغداد کا ہاروں رشیدا نام ہے

درج بالا مصرعے میں 'ہارون رشید' کی بجائے 'ہاروں رشیدا' کہنا ان کی موزونیٔ طبع کا پتہ دیتا ہے اور اتنی صغرسنی میں مصرعہ کہنا کلیم عاجزؔ کی فطری شاعرانہ صلاحیت اور شاعرانہ ذوق کا غمّاز ہے۔

اسی طرح ۱۹۳۷ء کی بات ہے، جب وہ اپنے والد کے ساتھ کلکتہ میں تھے۔ ان کے گاؤں کے دو چار ساتھی وہاں پہنچے اور انہیں بتایا کہ 'جلسہ' میں ایک طرحی مشاعرہ ہونے والا ہے۔ اس وقت تک کلکتہ کی ادبی اور شعری فضا نے کلیم عاجزؔ کی طبیعت میں موزونی بھر دی تھی؛ اس لیے دوستوں کی بات سن کر ان کا شعری ذوق بیدار ہوا اور ان کی شاعرانہ صلاحیت عود کر آئی، چناں چہ انہوں نے مصرع طرح پر اپنی زندگی کی پہلی غزل کہی اور اپنے لیے عاجزؔ تخلّص منتخب کر کے پہلی بار اس غزل میں استعمال کیا۔ اس غزل کا مقطع درج ذیل ہے۔

تھی فرمائش بزرگوں کی تو لکھ دی یہ غزل عاجزؔ
وگرنہ شاعری کا تجربہ ہم کو بھلا کیا ہے

۱۹۳۹ء میں جب کلیم عاجزؔ، پٹنہ میں زیر تعلیم تھے تو پٹنہ کالج میں بزم ادب کی جانب سے فی البدیہہ مشاعرہ منعقد کیا گیا، جس میں صرف طلبا کو شامل ہونے کی اجازت تھی۔ کلیم عاجزؔ بھی اس مشاعرے میں شامل ہوئے۔ مصرع طرح تھا۔ ع

دَرد منت کش دَوا نہ ہوا

کلیم عاجزؔ کی فی البدیہہ غزل کے دو اشعار درج ذیل ہیں۔

یوں تو دنیا میں اور کیا نہ ہوا
پر جو اپنا تھا مدعا نہ ہوا

بام پر وہ جو بے نقاب آئے
سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

اس مشاعرے میں کلیم عاجزؔ کی غزل کو سب سے بہتر قرار دیا گیا اور انہیں پہلا انعام عطا کیا گیا۔ اس واقعہ سے کلیم عاجزؔ کی شاعرانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی مشاعرے میں کلیم عاجزؔ نے اپنی وہ غزل بھی پڑھی، جس پر انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے دوست عبدالخالق کے مشورے سے حافظ شمس الدین منیری سے اصلاح لی تھی۔

اس کے بعد کلیم عاجزؔ نے ۱۹۴۰ء میں بی-این کالج کے موضوعاتی انعامی مقابلے میں حصہ لیا اور اقبال پر ۲۴ر اشعار میں اپنے خیالات کا منظوم اظہار کر کے سید حسن صاحب کے ہاتھوں پہلا انعام حاصل کیا۔ نظم کا پہلا شعر درج ذیل ہے۔

اقبال اے مفکّر عالی خیالِ ہند
اے فلسفی اے شاعرِ شیریں مقالِ ہند

اس طرح مذکورہ بالا ماحول میں کلیم عاجزؔ کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر ہوئی اور ان ہی حالات میں ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی، پھر دھیرے دھیرے ان کی شاعرانہ صلاحیت پروان چڑھتی گئی اور ان کا شعری ذوق نکھرتا گیا۔

شاعری کا محرّک و آغاز

یوں تو کلیم عاجزؔ نے ماحول کے اثر اور طبیعت کی موزونی کے سبب بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور گیارہ برس کی عمر میں ۱۹۳۷ء میں جب وہ کلکتہ میں مقیم تھے، اپنی زندگی کی پہلی غزل کہی جو کہ مصرع طرح پر تھی اور اس کے بعد 'بزمِ ادب' پٹنہ کالج کے فی البدیہہ مشاعرے میں فی البدیہہ غزل کہہ کر پہلا انعام حاصل کیا اور پھر بی-این کالج کے انعامی مقابلے میں اقبالؔ پر ایک نظم لکھ کر بھی پہلا انعام حاصل کیا؛ لیکن اس وقت تک انہوں نے با قاعدہ اور باضابطہ شاعری شروع نہیں کی تھی؛ بلکہ ان کی شاعری محض تفنّنِ طبع کا ایک ذریعہ تھی اور اسے کلیم عاجزؔ نے باضابطہ اپنے اظہارِ خیال کا وسیلہ نہیں بنایا تھا۔ اس وقت تک ان کی طبیعت باضابطگی کے ساتھ شعر و سخن کی طرف مائل نہیں ہوئی تھی؛ بلکہ حسبِ ضرورت وحسبِ خواہش شعر کہہ لیا کرتے تھے، گویا ان کی طبیعت میں شعر گوئی کے لیے اس وقت تک کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی۔

کلیم عاجزؔ کی باضابطہ شاعری کا محرک اور ان کی غزل گوئی کا سبب ۱۹۴۶ء کا وہ دَردناک، المناک، انسانیت سوز اور حیوانیت ساز واقعہ ہے، جس میں مذہب وملّت کے نام پر سارے ہندوستان میں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اس فساد میں نہ جانے کتنے گاؤں اُجڑ گئے، کتنے گھر جل گئے، کتنی سہاگنوں کا سہاگ لُٹ گیا، کتنے بچے یتیم ہو گئے اور نہ جانے کتنے معصوم خنجروں سے لپٹ کر موت کی نیند سو گئے۔

لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے
بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا

ان ہی شہید ہونے والی بستیوں میں ایک بستی تیلہاڑا اور ان ہی برباد ہونے والے افراد میں ایک فرد کلیم عاجزؔ بھی ہیں۔ ۳؍نومبر ۱۹۴۶ء کو اس فرقہ وارانہ فساد کی آگ کلیم عاجزؔ کی بستی تیلہاڑا تک بھی جا پہنچی، جس نے ٹھیک بقرعید کے دن اس ہنستی کھیلتی اور جیتی جاگتی بستی کو سات آٹھ سو مسلمانوں سمیت جلا کر بھسم کر ڈالا۔

یہ مختصر سی ہے روداد صبح میخانہ
زمیں پہ ڈھیر تھا ٹوٹے ہوئے پیالوں کا

ان شہید ہونے والوں میں کلیم عاجزؔ کی عزیز از جان والدہ ماجدہ اور چھوٹی بہن رشیدہ بھی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی دس پندرہ افراد ایسے تھے، جو کلیم عاجزؔ کے بہت نزدیکی رشتہ دار تھے، جن کی ہر بات اور جن کا ہر عمل کلیم عاجزؔ کی آنکھوں کے سامنے اب بھی گردش کرتا رہتا ہے۔ کلیم عاجزؔ اس لیے بچ گئے کہ اس وقت وہ تیلہاڑا میں موجود نہ تھے؛ بلکہ پٹنہ میں تھے۔ اس المناک اور اندوہناک واقعہ کا کلیم عاجزؔ پر بڑا ہی گہرا اثر پڑا۔

ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہا نہ جائے
تیرا درد اتنا بڑا حادثہ ہے
کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے
میرے لیے قید سحر و شام نہیں
روتا ہوں کہ رونے کے سوا کام نہیں

اس جانکاہ واقعے نے کلیم عاجزؔ کو سخنور بنا دیا، انہیں بولنا سکھا دیا، انہیں غم آشنا کر کے ایک منفرد لب ولہجہ عطا کر دیا اور پھر ان کے دل کی غمگینی اور ان کے جگر کی سوزش شاعری کا روپ بدل کر دنیا کے سامنے آنے لگی۔

چند آہوں کا موقع ہے کلامِ عاجزؔ
ڈال کر رکھا ہے نقاب اس پہ غزل خوانی کا
جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

گویا کلیم عاجز کی شاعری کیفیت دل کی ترجمان بن گئی۔ انہوں نے اپنی شاعری کو باضابطہ اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنالیا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس اندوہناک حادثے کو ہی شاعری بنالیا اور شاعری کے پردے میں اپنا زخمِ دل دکھانے لگے۔

ہر شعر ہے تصویر میرے زخمِ جگر کی
ہاں دیکھ کہ پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا
اشعار میں سجا کے بنا کے سنوار کے
کہئے تو ہم بھی زخم دکھائیں بہار کے
تم بھی نہیں سمجھو تو بڑا ظلم ہے پیارے
ہر شعر میں دل کا کوئی پیغام رہے ہے

کلیم عاجز کے دل کی غمگینی نے ان کی شاعری کو وہ سوز، وہ دردمندی، وہ خلوص، وہ تغزل، وہ لطافت اور وہ تیور عطا کئے کہ جس کی مثال قدیم وجدید شعراء میں سوائے میر کے، کہیں اور نہیں ملتی۔

المختصر ۱۹۴۶ء کا فساد کلیم عاجز کی شاعری کا محرک ہے۔ وہ انہیں ایک ایسا غیر فانی غم دے گیا ہے، جو انہیں آمادۂ شعر وسخن کرتا رہتا ہے اور شاعری کے لیے مواد عطا کرتا رہتا ہے۔ گویا اس حادثے نے کلیم عاجز کی تمام تر شاعرانہ صلاحیت کو اُبھار کر انہیں باضابطہ شاعر بننے پر مجبور کردیا اور انہیں دَرد کا ایک ایسا قیمتی سرمایہ دے گیا، جو معیاری اور اعلیٰ درجہ کی شاعری کے لیے ضروری اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ بقول شیلے:

"Our sweetest songs are those that
tell us saddest thoughts."

(یعنی ہماری بہترین شاعری وہ ہے، جو ہمیں داستانِ غم سناتی ہے۔)

کلیم عاجز کی شاعری میں بلا کا دَرد اور غضب کا سوز ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعی رنگ کو سمجھنے کے لیے یہ شعر کافی ہے۔

لے جا رہا ہوں دَرد میں ڈوبی ہوئی غزل
بے درد کے لیے کوئی سوغات چاہئے

دردمندی کے سبب ان کی غزلوں میں ایسی کشش اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے جو ہر شخص کا دل اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے۔ اپنے شعر کی اس خصوصیت کا احساس خود کلیم عاجز کو بھی ہے۔

یہ کشش اظہارِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں
وہ بھی سر دھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں
تری محفل میں کس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میر سے کچھ کم نہیں پیارے

غرض ۱۹۴۶ء کے خونی واقعے نے کلیم عاجز کے دل کو ایک شاعر کا دل اور ان کی زبان کو ایک شاعر کی زبان بنا دیا اور ان کو متاعِ درد دے کر گویا سرمایہ شاعری عطا کردیا۔ کلیم عاجز اس واقعے کو اپنی شاعری کا محرک اور سبب بتاتے ہوئے بڑے ہی دلنشیں اور دلپذیر انداز میں فرماتے ہیں۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا، وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لیے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنے مجموعۂ غزل کا نام 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' اور اپنی خودنوشت سوانح عمری کا عنوان 'ادا کیوں کر کریں گے، چند آنسو دل کا افسانہ' تجویز کیا۔

مذکورہ بالا حادثے اور حالات کے زیر اثر کلیم عاجز نے ۱۹۴۹ء میں پہلی باضابطہ غزل کہی اور اسے 'انجمن رفیق الشعراء' کے زیر اہتمام منعقد مشاعرے میں شریک ہوکر پڑھی جس کا مقطع درج ذیل ہے۔

غزل سن کر مری بولے انہیں کا نام عاجز ہے
یہی ہیں وہ جو اپنے کو بڑا قابل سمجھتے ہیں

اس طرح ان کی باضابطہ غزل گوئی اور مشاعرے میں شرکت کا آغاز ہوا اور اس کے بعد یہ سلسلہ جاری ہوگیا۔

'انجمن رفیق الشعراء' کی شعری مجلسوں نے کلیم عاجز کی شاعرانہ صلاحیت کو خوب جلا دی اور ان کے شعری ذوق کو کافی پروان چڑھایا۔ کلیم عاجز اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''انجمن رفیق الشعراء کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ اس نے شعر وغزل کی دنیا میں میرے لیے راستہ کھول دیا''۔

(''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی...'')

غرض متاعِ درد حاصل کرنے کے بعد کلیم عاجز میں جو شاعرانہ صلاحیتیں عود کرآئی تھیں اسے 'انجمن رفیق الشعراء' کی شعری مجلسوں نے چمکایا، نکھارا، سجایا اور سنوارا اور اس مناسب اور موافق ماحول میں کلیم عاجز کی شاعری باضابطگی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔

کلیم عاجز اور مشاعرہ

خوش گلو، خوش فکر شاعر ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کا مشاعروں سے ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہندستان کا کوئی مشاعرہ خصوصاً شمالی ہند کا مشاعرہ اس وقت تک کامیاب اور شعراء کی فہرست اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی، جب تک کلیم عاجز کا نام اس میں شامل نہ ہو۔ کلیم عاجز کو بھی اپنی اس اہمیت کا خوب اچھی طرح احساس ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بلاتے کیوں ہو عاجز کو بلانا کیا مزہ دے ہے
غزل کم بخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے

❁

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیم نہ ہوگا، مزا نہ آئے گا

❁

ضرور آیا کرو جلسے میں عاجز
نہ آؤ ہو تو سنّاٹا لگے ہے

❁

اچھے اشعار کہہ لینا اور اعلیٰ درجہ کی شاعری کر لینا ایک الگ فن ہے اور مشاعرے میں بڑی ثابت قدمی اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی تخلیق سنا کر سامعین کا دل جیت لینا ایک الگ ہنر ہے۔ یہ سب کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ایک دشوار گزار اور مشکل امر ہے؛ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ خلوت پسند، نازک طبع اور کم سخن شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز اس صلاحیت اور خوبی سے بھی آراستہ ہیں اور اس فن میں طاق ہیں۔ ان کی آواز میں بلا کا دَرد اور غضب کا سوز ہے۔ ان کے لَحن میں ایسی کشش اور جاذبیت ہے کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتا تھا اور ہر فرد ہمہ تن گوش ہو کر سننے کے لیے مجبور ہو جاتا تھا۔ اپنی اس خداداد صلاحیت کے سبب کلیم عاجز مشاعرے کی رونق سمجھے جاتے تھے اور اپنے حسین خیالات اور دلکش آواز کی مدد سے سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے اور ہر سامع کے دل کے تار کو بڑی فنکاری سے چھیڑ جاتے تھے۔ وہ اپنے لَحن کی کشش اور اپنی آواز کے سوز سے اچھی طرح واقف تھے؛ اس لیے فرماتے :

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

❁

بلاتے کیوں ہو عاجز کو بلانا کیا مزہ دے ہے
غزل کم بخت کچھ ایسی پڑھے ہے، دل ہلا دے ہے

❁

کلیم عاجز مشاعرے کی رونق، مشاعرے کی روح اور مشاعرے کی زینت تھے۔ مشاعرے سے ان کی شاعرانہ شخصیت کا ایک اٹوٹ رشتہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کلیم احمد کو 'کلیم عاجز' بنانے؛ یعنی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور جِلا بخشنے میں مشاعروں کا زبردست حصہ ہے۔ کلیم عاجز جب اپنے بڑے سالے ظہیر صاحب کی دعوت پر سب سے پہلے 'انجمن رفیق الشعراء' کے مشاعرے میں سامع کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو وہاں ان کے اندر کا سویا ہوا شاعر جاگ پڑا اور ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہو گیا۔ وہ اس مشاعرے کے تاثرات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہال میں محفل برخاست ہوئی۔ میرے دل میں محفل جم گئی.... ایسا معلوم ہوا

جیسے میرا دل کچھ سوچ رہا ہے، کچھ کہنا چاہ رہا ہے، انگڑائیاں لے رہا ہے، کروٹیں بدل رہا ہے، جیسے کوئی خواب سے جاگنے کی کوشش کررہا ہے.... 'انجمن رفیق الشعرا' کا مشاعرہ دل پر سے کچھ پردہ اُٹھا گیا.... اور میں بے تکان شعر کہنے لگا''۔

(''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی.....'')

کلیم عاجز کو ہندستان گیر پیمانے پر شہرت عطا کرنے اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے میں بھی مشاعروں ہی کا زبردست حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی بیشتر غزلیں مشاعرے کے لیے کہیں اور ان سے جو بھی متعارف ہوا، مشاعرے کے توسط سے ہوا۔

ان کے مجموعۂ غزل 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' میں چار اہم شخصیتوں کے تبصرے بھی شامل ہیں۔ ان چاروں مبصّروں کا بھی یہی بیان ہے کہ ہم کلیم عاجز سے مشاعرے ہی کے ذریعہ متعارف ہوئے ہیں۔ نقادِ اعظم کلیم الدین احمد فرماتے ہیں:

''کلیم عاجز کی غزل میں نے پہلی بار پڑھی نہیں! بلکہ سنی۔ ان کی آواز بڑی مترنّم ہے اور پڑھنے کا ڈھنگ دلکش ہے''۔

ڈاکٹر جمیل مظہری کہتے ہیں:

''کلیم عاجز گرچہ چار سال میرے اسٹوڈنٹ پٹنہ یونیورسٹی میں رہے؛ مگر اس زمانۂ طالب علمی سے قبل پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں منگل تالاب کے ایک محفل سخن میں دیکھا''۔

سید علی عباس مرحوم (چیئر مین 'بزم کاف') رقم طراز ہیں:

''میں نے ۱۹۵۲ء میں کلیم عاجز کو پہلی بار دیکھا اور سنا''۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اردو شاعری کی ایک بیش بہا شخصیت کا نام ہے۔ فراق بڑے غیور اور عالی مرتبت شاعر ہیں، وہ کسی سے جلد متاثر نہیں ہوتے، انہیں اپنی ذات پر فخر اور ناز تھا؛ اس لیے انہوں نے فخریہ کہا:

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا تھا

❁

لیکن یہی فخریہ شعر کہنے والے خود اس بات پر فخر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

'''میں اپنی زندگی کی اہم خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجز صاحب کا کلام خود ان کے منھ سے سننے کا موقع ملا''۔

(''وہ جو شاعری کا سبب ہوا.....'')

لہٰذا کلیم عاجز کی یہ شاعرانہ تعلّیاں بے جا نہیں۔

تو سب کی سنے ہے کبھی میری بھی غزل سن
پھر ایسا خوش اسلوب دوبارہ نہیں ہوگا

❁

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں ہیں کسی سے کہا نہ جائے گا

❁

اس سے کہہ دو جو بہت مست مئے ناز میں ہے
اس کی آنکھوں میں ہے جادو مری آواز میں ہے

کلیم عاجز کی شخصیت مشاعروں کے اسٹیج سے اُبھری، سنوری، نکھری اور چمکی۔ عام طور سے اب وہ مشاعروں میں شرکت کرنا کم پسند کرتے تھے، اس کی وجہ مشاعروں کا گرتا ہوا معیار، یا سامعین کی بدذوقی ہوسکتی ہے؛ لیکن کلیم عاجز کا یہ فرمانا کہ:

''میں جو کچھ کہتا ہوں، وہ دوسروں کے لیے نہیں اپنے لیے کہتا ہوں، سنانا مقصود کم ہے، گنگنانا اصل مقصد ہے۔ کون مانے کہ جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ کہتا رہا ہوں، وہ ایک خاموش خودکلامی ہے''۔

ناقابل تسلیم ہے۔ کوئی کیوں مانے؟ اور کیسے مانے؟ کیوں کہ کلیم عاجز کی شاعری کے بغور مطالعے سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتی ہے کہ:

گنگنانا مقصود کم ہے، سنانا اصل مقصود ہے

اس میں خودکلامی نہیں؛ بلکہ اپنے دل کی بات دوسروں کو سنانے کی تڑپ ہے۔ ان کی غزلوں میں کثرت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں، یا بالفاظ دیگر وہ غزل گنگنانے کے لیے نہیں؛ بلکہ مشاعروں میں

سنانے کی غرض سے کہتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

وہ جو شاعری کا سبب ہوا، وہ معاملہ بھی عجب ہوا
'میں غزل سناؤں ہوں' اس لیے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

درج بالا شعر میں 'میں غزل کہوں ہوں' کی بجائے 'میں غزل سناؤں ہوں' ہے، جو اس بات کا غمّاز ہے کہ وہ اپنی غزل دوسروں کو سنانا چاہتے ہیں۔

اس طرح کی بکثرت مثالیں ان کے کلام میں مل جاتی ہیں۔ صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تو سب کی سنے ہے کبھی میری بھی غزل سن
پھر ایسا خوش اسلوب دوبارہ نہیں ہوگا

❁

مری جیسی کہانی کم سنو گے
گل و بلبل کے افسانے بہت ہیں

❁

یہ کشش اظہارِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں
وہ بھی سر دُھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں

❁

غزل جو حضرتِ عاجزؔ سنایا کرتے ہیں
وہ شاعری تو نہیں، شاعری کا ماتم ہے

❁

وہی سمجھتے ہیں مجھ کو جو مجھ کو سنتے ہیں
مری غزل میں مری زندگی مجسّم ہے

❁

رونا آتا ہے تو آجاتے ہیں گانے کے لیے
ہم کو آساں ہے، جو مشکل ہے زمانے کے لیے

❁

پڑھنے کو غزل عاجزؔ محفل میں جب آئے ہیں
اپنے بھی روئے ہے ہم کو بھی رُلائے ہے

❁

ضرور آیا کرو جلسے میں عاجزؔ
نہ آؤ ہو تو سنّاٹا لگے ہے

❁

بیاں جب کلیمؔ اپنی حالت کرے ہے
غزل کیا پڑھے ہے، قیامت کرے ہے

❁

جھومتے ہیں سب مرے اشعار پر
میرے دل میں سب کے دل کی بات ہے

❁

جو سنا رہا ہے غزل تمھیں یہ وہی کلیمؔ ہے مہرباں
جو گروہ اہلِ کمال میں، نہ شمار اہل ہنر میں ہے

❁

غزل سنی تو وہ بولے کہ تم تو اے عاجزؔ
ہو خوش کلام بھی ایسے ہی، کم سخن جیسے

❁

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ، وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پر گذری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

❁

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات بحسن وخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے گنگنانے کے لیے نہیں؛ بلکہ دوسروں کو سنانے کے لیے غزلیں کہی ہیں، لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ 'میں نے گنگنانے اور دل کو بہلانے کے لیے غزلیں کہی ہیں'، محض ان کی تکلف بیانی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف سنانے کے لیے اشعار نہیں کہتے ہیں؛ بلکہ اپنے فن کی بھرپور داد بھی چاہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

تم میرے فکر و فن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دنیا میں کھینچ لاؤں فضائے بہشت کو

❀

اگرچہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے:

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو

لیکن یہ ان کی دل کی بات نہیں، محض تکلف بیانی ہے۔ دوسری جگہ سچی بات اور دل کی بات ان کے منھ سے نکل ہی گئی ہے۔ وہ اپنی اس برعکس بیانی کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'غالبؔ کہتے ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ غالبؔ کہہ رہے ہیں کچھ اور، مطلب ہے کچھ اور.... وہ چاہتے ہیں کہ خدا کرے سب سمجھ جائیں.... سب اس کے لیے مر رہے ہیں کہ خدا کرے ان کا کہا لوگ سمجھ جائیں.... میں بھی اسی طرح کی بات کہتا ہوں:

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو'

(''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی......'')

اسی طرح وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

نہ کلیم کی کبھی مانیو، کبھی دل نہ اس کا بڑھائیو
جو کرو ہو تم سو کیا کرو، وہ غزل کہے ہے کہا کرے

اس شعر میں وہ دراصل اس بات کے متمنی ہیں کہ ان کی بات مانی جائے اور ان کا دل بڑھایا جائے۔ ایک فن کار کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کے فن کی بھرپور داد ملے اور اس کی پوری قدر کی جائے؛ لیکن فکر کی جدّت، انداز کی قدامت، خیال کی ندرت، بیان کی لطافت اور لہجے کی سلاست کے باوجود جب ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی تو وہ شکوہ بہ لب نظر آتے ہیں:

سنا ہے لوگ فن سے صاحبِ فن تک پہنچتے ہیں
مگر ہم تک ہمارے ڈھونڈھنے والے کہاں پہنچے؟

المختصر کلیم عاجزؔ نے مشاعرے کے لیے غزلیں کہیں اور ان کے عروج کا ستارہ مشاعروں کے اسٹیج سے چمکا اور ہمارے شعری حواس پر چھا گیا۔

کلیم عاجزؔ نے سب سے پہلے جس مشاعرے میں شرکت کی وہ پٹنہ کالج کا فی البدیہہ مشاعرہ تھا، جسے 'بزمِ ادب' نے ۱۹۳۹ء میں منعقد کیا تھا۔ مصرع طرح تھا ؎

درد منّت کش دوا نہ ہوا

کلیم عاجزؔ نے مصرع طرح پر فی البدیہہ ایک خوبصورت سی غزل کہی اور پہلا انعام حاصل کیا۔ جس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں تو دنیا میں اور کیا نہ ہوا
پر جو اپنا تھا، مُدّعا نہ ہوا
بام پر وہ جو بے نقاب آئے
سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

مشاعرے میں انہوں نے اپنی ایک اور غزل سنائی، جس پر انہوں نے حافظ شمسؔ منیریؔ سے اصلاح لی تھی۔

کلیم عاجزؔ کا دوسرا مشاعرہ 'انجمن رفیق الشعرا' کا مشاعرہ ہے، جو لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی میں منعقد ہوا تھا۔ ۱۹۴۹ء کی بات ہے کہ ایک دن ان کے بڑے سالے جناب ظہیر صاحب ان کی دُکان پر آئے اور ان کو 'انجمن رفیق الشعرا' کے مشاعرے میں آنے کی دعوت دی۔ اتفاق سے اس بار نشست ظہیر صاحب کے گھر پر تھی۔ کلیم عاجزؔ سامع کی حیثیت سے مشاعرے میں تشریف لے گئے اور جب وہاں سے واپس آئے تو ایک عجیب کیفیت لے کر لوٹے (جس کا ذکر ہو چکا ہے)۔ وہاں سے آنے کے بعد ان کی شاعرانہ صلاحیتیں عود کر آئیں اور انہیں شعرگوئی کی زبردست خواہش ہوئی اور جب اگلی بار 'انجمن رفیق الشعراء' کا مشاعرہ ہوا تو اس میں کلیم عاجزؔ بھی بحیثیت شاعر شریک ہوئے۔ مشاعرہ طرحی ہوا کرتا تھا اور اس بار مصرع طرح تھا ؎

وہ اپنا دل بتاتے ہیں ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

جب کلیم عاجزؔ کی باری آئی تو انہوں نے اپنی غزل تحت اللفظ میں سنائی۔غزل کا مقطع درج ذیل ہے:

غزل سن کر مِری بولے انہیں کا نام عاجزؔ ہے
یہی ہیں وہ جو اپنے کو بڑا قابل سمجھتے ہیں

اس مشاعرے کے بعد ان کی باضابطہ غزل گوئی اور مشاعرے میں شرکت کا آغاز ہوگیا۔وہ کثرت سے غزلیں کہنے لگے اور دھیرے دھیرے ان کی شہرت ہونے لگی۔غرض کہ کلیم عاجزؔ کو باضابطہ شاعر بنانے میں 'انجمن رفیق الشعرا' کا ہاتھ ہے اور وہ خود اس بات کو تسلیم بھی کرتے ہیں:

''انجمن رفیق الشعراء' کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ اس نے شعر و غزل کی دنیا میں میرے لیے راستہ کھول دیا''۔

(''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی......'')

'انجمن رفیق الشعرا' کا ایک دلچسپ اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ایک بار طرحی غزلوں کے بعد جب غیر طرحی غزلوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کلیم عاجزؔ سے بھی فرمائش کی گئی۔کلیم عاجزؔ نے معذرت چاہی اور کہا: 'میرے پاس کوئی بے پڑھی غزل نہیں ہے'؛ لیکن اصرار مسلسل ہوتا رہا، مجبور ہوکر کلیم عاجزؔ نے آرزوؔ لکھنوی کی ایک خوبصورت سی غزل ترنّم کے ساتھ اپنے نام سے پڑھ دی:

پھیر تو لیں گے چھری زہر بھی کھائیں گے ہم
یوں نہ موت آئی تو پھر بے موت مر جائیں گے ہم
وقتِ رخصت مجھ سے دو دو کام ہو سکتے نہیں
ان کو روکیں گے کہ اپنے دل کو سمجھائیں گے ہم

لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ بھرے مجمع میں کوئی بھی انہیں پکڑ نہ سکا اور کلیم عاجزؔ داد وصول کر کے رخصت بھی ہوگئے۔

'انجمن رفیق الشعرا' کے بعد کلیم عاجزؔ کی دوسری بزم 'انجمن نو بہار ادب' ہے، جو اسی زمانہ میں قائم ہوئی تھی، اس کے صدر سید حمیدؔ عظیم آبادی اور سکریٹری محمود حسین صہباؔ تھے، جو کلیم عاجزؔ کے دوستوں میں تھے۔اس انجمن کے مشاعروں میں خصوصاً شاگردانِ شادؔ اور تلامذۂ حمیدؔ عظیم آبادی شریک ہوا کرتے تھے۔

'انجمن نو بہار ادب' کے متوازی ایک اور انجمن 'میخانۂ ادب' قائم ہوئی۔کلیم عاجزؔ نے اس

میں بھی اپنی غزلیں پڑھیں؛ لیکن چند اہم نشستوں کے بعد یہ انجمن ختم ہوگئی۔اس زمانے کی ایک اور یادگار انجمن 'یارانِ میکدہ' ہے، جس کی نشستیں ہوا کرتی تھیں اور مشاعرے کے ساتھ پرتکلّف دعوت بھی ہوا کرتی تھی۔اس مناسبت سے لوگ اس کو 'پلاؤ پارٹی' کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

غرض شعر و ادب کے مناسب ماحول ملنے کی وجہ سے کلیم عاجزؔ کی شاعرانہ صلاحیتیں اُبھرتی اور نکھرتی گئیں اور وہ مشاعرے کی دنیا میں ممتاز ہوتے گئے۔

جب کلیم عاجزؔ کی شہرت پٹنہ سے باہر پہنچی تو انہیں ۱۹۵۱ء میں پہلی بار پٹنہ سے باہر جمشید پور کے مشاعرے میں بلایا گیا، جس کو 'بزمِ فرح' نے منعقد کیا تھا اور پھر اس کے بعد مشاعروں کی دعوت و شرکت کا سلسلہ سا بندھ گیا۔آپ ہندستان کے مختلف گوشوں دلّی، کلکتہ، مدراس، غرضیکہ ہر جگہ مشاعرے میں مدعو کئے جانے لگے۔۱۹۶۰ء میں آپ نے پہلی بار لال قلعہ (دلّی) کے عظیم الشان مشاعرے میں شرکت فرمائی۔

کلیم عاجزؔ کی شہرت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ رہی؛ بلکہ وہ دیگر ممالک میں بھی جا پہنچی، چناں چہ ۱۹۶۶ء میں پہلی بار انہیں ہندستان سے باہر جدّہ کے مشاعرے میں بلایا گیا، پھر ۱۹۷۸ء میں پاکستان بلائے گئے۔اس کے بعد انہیں متعدد بار پاکستان کے مشاعروں میں شرکت کے مواقع ملے۔مشاعروں کے سلسلے میں انہیں اب تک کئی بار امریکہ بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔پہلی بار ۱۹۷۹ء میں 'مسلم کمیونیٹی سنٹر' کی دعوت پر اور دوسری بار 'ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی' کی دعوت پر امریکہ گئے تھے۔

المختصر کلیم عاجزؔ کی شہرت و مقبولیت کا ستارہ مشاعروں کے اسٹیج سے چمکا اور پھر ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر کے بین الاقوامی سطح پر جگمگانے لگا۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا...

(ایک مختصر تعارف)

'وہ جو شاعری کا سبب ہوا...' ڈاکٹر کلیم عاجز کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ابتدائے شاعری ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک کی غزلیں یکجا کی گئی ہیں۔ غزلوں کی مجموعی تعداد ایک سو نوّے ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

غزلوں کی نوعیت	تعداد غزل	کل اشعار کی تعداد
(۱) چار اشعار کی غزلیں	۱۰	۴۰
(۲) پانچ اشعار کی غزلیں	۴۵	۲۲۵
(۳) چھ اشعار کی غزلیں	۷۱	۴۲۶
(۴) سات اشعار کی غزلیں	۳۳	۲۳۱
(۵) آٹھ اشعار کی غزلیں	۲۱	۱۶۸
(۶) نو اشعار کی غزلیں	۶	۵۴
(۷) دس اشعار کی غزلیں	۴	۴۰
کل میزان	**۱۹۰**	**۱۱۸۴**

ان غزلوں کی ترتیب، عمرِ تخلیق، یا ارتقائے شاعری کے اعتبار سے ہے اور اس سلسلے میں کلیم عاجز نے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ یہ ترتیب لگ بھگ صحیح ہو۔ غزلوں کی اس ترتیب

سے کلیم عاجز کے مختلف دَور کی غزلوں کو بآسانی علاحدہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے ان کی شاعری کے ارتقا کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

کلیم عاجز کے اس مجموعۂ غزل کی اشاعت کے سلسلے میں کیے گئے اہتمام بھی قابل ذکر ہیں۔ سید علی عباس (ڈی.آئی.جی) اور جناب فخر الدین ونک نے کلیم عاجز سے اصرار کر کے ان کی غزلوں کو یکجا کروایا اور اس مجموعے کی طباعت میں اس درجہ اہتمام کیا کہ شاید ایسا اہتمام اب تک کسی دوسرے شاعر کے مجموعے کی طباعت میں نہ ہوا ہوگا۔

سب سے پہلے اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے تین ارکان پر مشتمل (کلیم عاجز صاحب، سید علی عباس صاحب اور جناب فخر الدین ونک) ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور اس کا نام تینوں اشخاص کے نام (انگریزی میں) کے ابتدائی تین حروف پر 'بزم کاف' (KAF) رکھا گیا۔ جناب فخر الدین صاحب اس کے ڈائرکٹر اور سید علی عباس صاحب چیئرمین بنے۔

اس کی کتابت کے لیے بہار کے مانے ہوئے خوش نویس عبدالرحمٰن صوفی صاحب کی خدمت حاصل کی گئی، پھر اسے نہایت عمدہ، قیمتی، سفید، دبیز کاغذ (Cartridge Paper) پر شری ہمالہ پریس، پٹنہ میں فوٹو آفسیٹ پر چھپوایا گیا، اس کا سائز ۱۰×۱/۲x۸×۳/۸ ہے۔ یہ ۳۳۲/ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی قیمت ایک سو دس روپے ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر صرف ایک ہی غزل ہے، جو کہ ایک خوبصورت حاشیے سے گھری ہوئی ہے۔

مجموعہ کے سر ورق پر ایک اجڑی ہوئی بستی کا خون آشام منظر ہے، جسے کلکتہ کے مشہور آرٹسٹ شری گور بوس نے بنایا ہے۔ گور بوس نے پہلے امریکہ سے ایک ڈیزائن بنوا کر منگوایا تھا، جس پر ایک جلتی ہوئی بستی کا منظر تھا؛ لیکن اسے نامنظور کر دیا گیا۔ مجموعہ کے سر ورق پر شفاف پلاسٹک کا ایک کور چڑھا ہوا ہے۔

کتاب کی خوش نویسی، طباعت اور سرورق کی تیاری، غرض کہ ہر مرحلے میں کافی اہتمام اور تزک واحتشام سے کام لیا گیا ہے اور کلیم عاجز کی شخصیت کی طرح سلیقہ اور نفاست کتاب کے ہر ہر پہلو سے نمایاں ہے۔

اس مجموعہ کے اشتہار اور پبلی سیٹی کے لیے دو تین طرح کے پمفلٹ اور فولڈرس چھاپے گئے۔ ان کا اہتمام، ان کی نفاست، ان کی جاذبیت، ان کی خوش رنگی اور ان کی پیشکش ایسی دل فریب ہے کہ منھ سے بے اختیار تعریفی کلمات نکل پڑتے ہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے سلسلے میں

کئے گئے اہتمام کا اندازہ فقط اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اس کے اشتہار پر ۱۹۷۵ء میں بیس ہزار کی رقم صرف کی گئی تھی، جو اس وقت کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔

اس مجموعہ میں غزل کے علاوہ تقریباً سو صفحات پر مشتمل کلیم عاجزؔ کی خود نوشت سوانح بھی شامل ہے، جو نثری ادب کا ایک بیش قیمت، نادر، دل کش اور منفرد نمونہ ہے، اس کے کلمات دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں جا بیٹھے ہیں۔ اس کو پڑھنے والے شخص کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور سننے والے کا دل اُمنڈ پڑتا ہے۔ اس کے مطالعے سے کلیم عاجزؔ کی شاعری کا پس منظر بھی اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

مجموعہ کے آغاز میں ڈاکٹر کلیم الدین احمد، علامہ جمیل مظہریؔ، سید علی عباس اور کتاب کی پشت پر فراقؔ گورکھپوری کے بڑے جامع اور اہم تبصرے بھی شامل ہیں، جن سے ہمیں کلیم عاجزؔ کی شاعری کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ تمام خوبیوں کے باوجود اس مجموعہ میں ایک نمایاں کمی یہ ہے کہ اس میں غزلوں کی فہرست نہیں ہے، جس کے سبب غزلوں کی تلاش بے حد مشکل ہے۔

۱۹۷۵ء کے آخر تک 'مجموعۂ غزل' کتابت کی منزل سے ہوتا ہوا طباعت کی منزل تک پہنچ گیا۔ ۱۹؍فروری ۱۹۷۶ء کو جناب فخر الدین علی احمد، صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں 'وگیان بھون'، نئی دہلی میں اس عظیم الشان مجموعہ کا اجرا عمل میں آیا۔

منظر عام پر آتے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ قدردانوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ دل شکستوں نے اسے اپنا ترجمان سمجھ کر سینے سے لگایا۔ عوام الناس نے اسے سر آنکھوں پر رکھا اور دو تین ہی برس کے مختصر سے عرصے میں اس قیمتی مجموعے کی ایک ایک جلد ختم ہو گئی، لہٰذا اس مجموعہ کی مقبولیت اور نایابی کو دیکھتے ہوئے امت الفاطمہ اکادمی، کراچی (پاکستان) نے کلیم عاجزؔ سے اجازت لے کر جنوری ۱۹۸۱ء میں اس کتاب کا عکس لے کر چھوٹے سائز میں لگ بھگ اسی نفاست کے ساتھ شائع کیا ہے اور ساتھ ہی اس میں غزلوں کی فہرست کا اضافہ کر کے اس کی ایک بڑی کمی کو دور کر دیا ہے۔ اس مجموعہ میں کلیم عاجزؔ کی مزید ۱۶؍ابتدائی غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں، جو پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئی تھیں۔

اس کے بعد اکتوبر ۱۹۹۶ء میں یہ کتاب حیدر آباد سے طوبیٰ پبلیکیشنز نے شائع کیا۔ اس میں ان کی مشہور نظم 'دعا' اور 'دربارِ رسالت' ابتدا میں شامل کر لی گئی ہیں۔

جب فصلِ بہاراں آئی تھی...

(ایک مختصر تعارف)

'جب فصلِ بہاراں آئی تھی....'، کلیم عاجزؔ کا دوسرا مجموعۂ غزل ہے، جسے مرتب کرنے کا شرف راقم السطور کو حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۹ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ ابتدا میں ۱۹۵۰ء کی جو غزلیں پہلے مجموعہ میں نہیں آسکی تھیں، انہیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

غزلوں کے علاوہ اس مجموعہ میں کلیم عاجزؔ کا سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل ایک گراں قدر دیباچہ بھی ہے، جس میں اردو شاعری، ترقی پسند تحریک، اقبالؔ، غالبؔ، میرؔ وغیرہ پر مختصر، مگر جامع خیالات کے اظہار کے ساتھ کلیم عاجزؔ صاحب نے اپنی شاعری سے متعلق بھی بڑے واضح اشارے کئے ہیں اور دیگر شعرا سے موازنہ کر کے اس کی اہمیت کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ دیباچہ اردو شاعری کے پس منظر میں کلیم عاجزؔ کی شاعری کی قدر و قیمت کو متعین کرنے اور شعر و شاعری سے متعلق ان کے نظریئے کو سمجھنے کے لیے بے حد مفید اور معاون ہے۔

اس مجموعہ میں کنہیا لال کپور کا ایک مقالہ 'کون یہ نغمہ سرا ہے میرؔ کے انداز میں' بھی شامل ہے۔ اس مقالہ میں کلیم عاجزؔ کو میرؔ کا ہم اسلوب اور ایک بلند پایہ شاعر بتایا گیا ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت میں بھی پہلے مجموعہ کی اشاعت کی طرح بے حد اہتمام کیا گیا ہے۔ فروری ۱۹۸۶ء میں 'حلقۂ علم و ادب' پٹنہ کے زیر اہتمام ایک نشست میں اس کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا، جس میں شاعر محترم ڈاکٹر کلیم عاجزؔ بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے حلقہ علم و ادب کے ارباب کے خلوص اور جذبے کے پیش نظر اس کی طباعت کی ذمہ داری سونپ دی۔ دو برسوں تک نہایت انہماک، دیدہ ریزی اور لگن کے ساتھ اس کی کتابت اور تصحیح و ترتیب کا سلسلہ چلتا رہا؛ لیکن نہایت افسوسناک بات یہ ہے کہ

اس مسودہ کو جن صاحب کو طبع کرنے کی ذمہ داری ان کی گزارش پر دی گئی تھی، وہ نہایت بد معاملہ نکلے اور اس مسوّدے کو اپنے کاروباری بقائے کے عوض میں دلّی کے ایک پریس میں رہن رکھ دیا اور کئی برس سے ٹال مٹول کر کے ہم لوگوں کو ہراساں کرتے رہے، جب حقیقت معلوم ہوئی تو دوسرے مسودے کی تیاری کی گئی اور یہ کام نہایت عجلت میں انجام پایا، جس کی وجہ سے تصحیح کا کام پورے طور سے نہیں ہو سکا اور اس مجموعہ میں بہت ساری غلطیاں راہ پا گئیں، جن کی فہرست آگے دی جا رہی ہے۔

دوسرے مجموعے کی اشاعت کے لیے جو لوگ شرف حاصل کرنے کے خواہشمند تھے، ان میں ڈاکٹر محمد صغیر الدین صاحب (جو اُن دنوں سعودی عرب میں مقیم تھے) کے نام یہ قرعہ نکلا اور انہوں نے اس مجموعہ کے سارے اخراجات اپنے ذمّے لیے اور اسے خوب سے خوب تر انداز میں شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جناب شرف الدین احمد، مالک سن رائز پلاسٹک ورکس، پٹنہ نے اس کی طباعت اعزازی طور پر کی اور اس کی اشاعت میں پوری دلچسپی لی۔

اس مجموعہ کی اشاعت دو قسموں پر مشتمل ہے۔ ایک طبع عام اور ایک طبع خاص، طبع خاص میں نہایت ہی عمدہ سفید کاغذ 'ایکز یکیوٹیو بونڈ' استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب نہایت عمدہ ریگزین کی جلد سے مزین ہے، جسے ایک نہایت دلکش ڈبّہ میں رکھا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مجموعہ بھی اپنی دلکش اور دیدہ زیبی میں منفرد اور ممتاز ہے۔

اس مجموعہ میں شامل غزلوں کی مجموعی تعداد ایک سو اکانوے (۱۹۱) ہے۔ ابتدا میں ایک غزل منفرد انداز میں شائع کی گئی ہے، جس کو 'عطر مجموعہ' کہنا صحیح ہے۔ اس غزل میں کلیم عاجز کی غزلوں کی روح اور ان کی شاعری کا نچوڑ ہے۔ اس لیے شاعر نے اس کا نام 'دیباچہ' تجویز کیا ہے۔ مجموعہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

نام	:	'جب فصلِ بہاراں آئی تھی.....'
مرتب	:	اسلم جاوداں
صفحات	:	۳۲۸ = ۸ + ۳۲۰
سن اشاعت	:	۱۹۹۰ء
تعداد	:	ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰)
کتابت	:	ابوالکلام عزیزی، عبدالباقی قاسمی
سائز	:	ڈیمائی (۲۳ × ۳۶×۸/۱)
طابع اعزازی	:	سن رائز پلاسٹک ورکس، پٹنہ
مالی سرپرست	:	ڈاکٹر محمد صغیر الدین (سعودی عرب)
کاغذ	:	ایکز یکیوٹیو بونڈ
غزلوں کی تعداد	:	ایک سو اکیانوے (۱۹۱)

ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ ...

(ایک مختصر تعارف)

''ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ''، کلیم عاجزؔ کا تیسرا اور آخری مجموعہ غزل ہے۔ جسے ان کی فرمائش پر اسلم جاوداں نے ان کے آخری ایام میں ان کی مختلف بیاضوں سے نکال کر یکجا کیا اور ۱۸/ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو مرتب کر کے ان کے سامنے پیش کیا۔ اس میں ۱۳۲ غزلیں اور مزید ایسی ۳۸ غزلیں شامل کی گئی ہیں، جو ان کے پہلے وہ مجموعہ غزل 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا...' اور 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی...' میں بھی شامل ہیں۔ یہ غزلیں اس مجموعے میں اس لئے شامل کی گئی ہیں کیونکہ ان میں کلیم عاجزؔ نے چند شعروں کا اضافہ کیا۔ آخر میں متفرق اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں، جو قبل کے مجموعہ میں شائع ہونے سے رہ گئے تھے۔

اس مجموعۂ غزل میں کلیم عاجزؔ نے حسب روایت ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ جسے انھوں نے ۱۵/ستمبر ۲۰۱۴ء کو مکمل کیا تھا۔ اس میں بھی کلیم عاجزؔ نے ماضی کی خوبصورت ادبی یادوں کے سرمائے سے بڑے خوبصورت موتی قرطاس پر بکھیرے ہیں اور تلہاڑا، پٹنہ، لکھنؤ، کراچی وغیرہ کے درجنوں واقعات اور اپنے شاعرانہ احساسات کو اتنے خوبصورت اور دلپذیر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ لفظ لفظ روشن اور فکر انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ہم پر اس زمانے کی تاریخ، طرز معاشرت، اخلاق و آداب، واقعات اور ادبی قدریں سب نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ اس مقدمے کے مطالعے سے کلیم عاجزؔ کا نظریہ شعر و ادب بھی ہم پر واضح ہوتا ہے اور بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب میں صالح اور اعلیٰ قدروں کے علمبردار ہیں۔ وہ جدید شاعری اور بے ہنگم تخلیقات کے قائل نہیں ہیں اور انھیں ادب تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

کلیم عاجز کے اس مقدمے میں انھوں نے حسب سابق اخلاقی اقدار، اعلیٰ انسانی جوہر اور ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھا ہے۔ ان کی نثری تحریروں کے بین السطور اخلاقی قدروں کی بازیافت کی تڑپ نمایاں ہے، لیکن ان کی پیش کش میں انھوں نے کبھی ادبیت اور حسن بیان کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ اس مقدمے کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ہم جہاں سے بھی اِس کتاب کو کھولیں اور پڑھنا شروع کریں، تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بات یہیں سے شروع کی گئی ہے اور باتوں

میں اتنی دِلچسپی وحسنِ بیان کا عنصر پنہاں ہے کہ قاری اس میں ڈوب جاتا ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نثر میں بلا کا حسنِ بیان، غضب کی اثر انگیزی اور فکر ونظر کی صالحیت کی کارفرمائی ہے۔ اگرچہ یہ نثری تحریر واقعات، حادثات، احساسات، جذبات اور اعلیٰ خیالات کے دِلکش موتی ہیں لیکن یہ افسانوں سے زیادہ دِلچسپ، کہانیوں سے زیادہ واقعات ساز اور ڈراموں سے زیادہ تحیر آمیز ہیں۔

کلیم عاجزؔ کے اِس مجموعے میں ابتداً دوطویل غزلِ مسلسل ہیں جن کو دیباچے کا نام دیا گیا ہے اور اِس ضمن میں لکھا ہے کہ یہ تلہاڑا کے گنجِ شہیداں کے قریب بیٹھ کر لکھی گئی ہیں۔ دونوں غزلیں شاعر کے شدّتِ غم اور شدّت احساس کی ترجمان ہیں۔ اس مجموعے میں اضافہ شدہ اشعار والی غزلیں اور متفرق اشعار شامل کر کے گویا کلیم عاجزؔ کے باقی ماندہ جملہ سرمایۂ سخن کو سمیٹ کر صفحہ قرطاس پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اس مجموعے کا ایک دردناک اور نا قابلِ فراموش پہلو یہ ہے کہ کلیم عاجزؔ نے اِسے اپنے آخری ایام میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اسلم جاوداں کو مرتب کرنے کے لئے دیا تھا اور بڑے اہتمام سے اس کا مقدمہ لکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ کتاب جلد از جلد شائع ہو جائے تا کہ جب وہ نومبر ۲۰۱۵ء میں امریکہ جائیں تو اس کی چند کاپیاں اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے ڈاکٹر وسیم احمد کو کئی بار تاکید کی، لیکن انھوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ کلیم عاجزؔ مغموم دل کے ساتھ امریکہ چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے اسلم جاوداں کو تین بار فون کر کے ہدایت دی کہ ''ڈاکٹر وسیم کو اس مجموعے کو جلد از جلد چھپانے کے لئے کہیں، تا کہ جب وہ امریکہ سے واپس آئیں تو اِس کتاب کو دیکھ سکیں۔ یہ ان کی دِلی خواہش ہے''۔ اسلم جاوداں نے ڈاکٹر وسیم کو بطورِ خاص یہ پیغام پہنچایا، لیکن انھوں نے ہر بار یہی کہا کہ ''اتنی جلدی کیا ہے؟ چھپ جائے گا...'' اس کے بعد کلیم عاجزؔ جب جنوری ۲۰۱۵ء میں واپس آئے تو مجموعے کی عدم اشاعت کی خبر سن کر بہت مایوس ہوئے...اور پھر بڑا المیہ یہ ہوا کہ ۱۵ر فروری ۲۰۱۵ء کو اپنے آخری مجموعے ''ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ'' کی اشاعت کی حسرت لئے دنیا سے چلے گئے۔

اسلم جاوداں کا مرتب کردہ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل، خوبصورت سرورق، اعلیٰ ترتیب و طباعت سے مزیّن یہ مجموعۂ کلام صرف کلیم عاجزؔ مرحوم کے گھر پر ہی دستیاب ہے، جس پر اس کی قیمت درج نہیں ہے۔ اس کی اشاعت کا سال ۲۰۱۴ء درج ہے، جب کہ یہ مجموعۂ کلیم عاجزؔ کے انتقال کے بعد ستمبر ۲۰۱۵ء میں شائع کرایا گیا تھا۔

کلیم عاجزؔ اور خدائے سخن میرؔ

شاعرِ درد کلیم عاجزؔ اور حسرت ویاس کے شاعر میر تقی میرؔ کی شاعری میں اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے حیرت انگیز مشابہت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی زندگی غموں سے دوچار رہی ہے۔ کلیم عاجزؔ خود اس کی توجیہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اتباع میری خمیر کے خلاف ہے۔ میرؔ سے کسی قدر جو مشابہت ہے، یہ مشابہت فن سے نہیں، زندگی سے آئی ہے۔ جس کا شعوری احساس بہت بعد میں مجھے ہوا''۔

یہ صحیح ہے کہ میرؔ اور کلیم عاجزؔ کی زندگی میں خانگی، معاشرتی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے مشابہت ہے۔ میر نے ابتدا سے لے کر آخری وقت تک غموں کے کارواں دیکھے۔ والد کی موت، منھ بولے چچا کی موت، خان آرزو سے ناچاقی، غم روزگار، غم جاناں، مصائب زمانہ، سیاسی انقلابات، اگر ان سب حالات پر نظر ڈالی جائے تو اپنے والد کی وفات سے لے کر آخر وقت تک میرؔ نے زندگی میں پریشانیوں، افلاس، ویرانیوں اور خانہ جنگیوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ آسودگی نام کی کوئی چیز ان کو زندگی میں کبھی مُیسر نہ ہوئی؛ اس لیے وہ کہتے ہیں:

سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں

غرض میرؔ نے ساری زندگی ناکامیوں کا منھ دیکھا اور حسرت و یاس ان کا مقدر بنی رہی۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اور کلیم عاجزؔ کہتے ہیں:

کتنا دُکھ، کتنی جفا، کتنا ستم دیکھا ہے
ہم نے اس عمر میں ایک عمر کا غم دیکھا ہے

میرؔ کی طرح کلیم عاجزؔ کی زندگی بھی غموں سے دوچار ہوتی رہی۔ انہوں نے جب میٹرک پاس کرنے کے بعد آئی-اے میں داخلہ لیا تو اس زمانے میں ان کے بڑے بھائی محمد سلیم احمد کی دق کی بیماری نے سنگینی اختیار کر لی، حالت ابتر ہوگئی۔ خبر ملنے پر تیلہاڑا پہنچے، جواں سال بھائی جاں بلب تھے، والد صاحب ان کے سرہانے سے لگے بیٹھے رہتے، بیٹے کے غم میں ان کا توانا جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا، آخر ایک دن زندگی اور موت کی کشمکش میں موت بازی لے گئی اور ان کے بڑے بھائی نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں، پھر کچھ ہی دنوں کے بعد بڑی بہن محمودہ خاتون بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ان حادثات کا ان کے والد صاحب پر بڑا گہرا اثر پڑا، غم سے ان کا سینہ چھلنی ہوگیا اور آخر اس غم نے ان کی جان بھی لے لی۔ والد صاحب کی موت کے بعد ان کے چھوٹے بھائی علیم احمد کی بھی دق کی بیماری نے شدت پکڑ لیا، دو سالوں تک زیر علاج رہے اور موت و حیات کی کشمکش جاری رہی؛ لیکن ستمبر ۱۹۴۶ء میں وہ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان مسلسل اموات سے کلیم عاجزؔ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور ابھی ان کے آنسو بھی خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ اس زمانے میں ہندستان میں آزادی کی اُمنگیں بڑے زور وشور سے کروٹیں بدلنے لگیں، پھر انگریزوں کی شاطرانہ چال سے مذہب و ملت کے نام پر کُشت و خون کا بازار گرم ہوا تو انسانیت بلک اٹھی اور مہینوں تک ہندستان کے مختلف حصوں میں حیوانیت اور سفاکیت کا ننگا ناچ ہوتا رہا۔

فرقہ وارانہ فساد نے نہ جانے کتنی بستیوں کو نیست و نابود کر دیا، کتنے خاندانوں کو تہہ تیغ کر دیا، کتنی سہاگنوں کے جبیں سے افشاں کو پوچھ ڈالا، کتنی ماؤں کی گود سونی کر دی، کتنے لالوں کے سر سے ماں کا ریشمی آنچل چھین کر اس کی جگہ گردش زمانہ کو مسلط کر دیا اور نہ جانے کتنے بے قصور اور معصوموں کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔

ان ہی تہس نہس ہونے والی بستیوں میں ایک بستی تیلہاڑا بھی ہے اور ایسے ہی خانماں برباد ہونے والے افراد میں کلیم عاجزؔ بھی ہیں۔ ۳۰؍نومبر ۱۹۴۶ء کو فرقہ وارانہ فساد کی آگ نے تیلہاڑا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ٹھیک بقرعید کے دن اس بستی کے سات آٹھ سو مسلمان بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔

لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے
بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا

ان شہید ہونے والوں میں کلیم عاجزؔ کی عزیز از جان والدہ ماجدہ (امت الفاطمہ) اور ان کی چھوٹی بہن رشیدہ خاتون بھی شامل تھیں۔ یہ خبر ان کے لیے بڑی جانکاہ تھی اور یہ غم ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ان کے علاوہ دس پندرہ ایسے افراد بھی شہید ہوئے جن کا کلیم عاجزؔ سے قریبی رشتہ تھا۔ گویا کہ کلیم عاجزؔ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ان کی خوشیاں یک لخت چھن گئیں، ان کی جنت ارضی تیلہاڑا فرقہ وارانہ فساد کی آگ میں جل کر بھسم ہوگئی اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندستان میں آزادی کے چراغ جلائے گئے تو اس میں کلیم عاجزؔ کے خاندان والوں کا لہو بھی جل رہا تھا، ان جلنے والے چراغوں کی لَو نے کلیم عاجزؔ کے جگر میں ایسی سوزش اور تپش بھر دی، جس میں وہ اس وقت سے آج تک مسلسل جل رہے ہیں۔

نہ ضمیر شمس و قمر میں ہے نہ مزاج برق و شرر میں ہے
وہ تپاک جو میرے دل میں ہے وہ تپش جو مرے جگر میں ہے

اس جانکاہ واقعہ نے ان کے لبوں سے ہنسی چھین کر ان کی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے اشک ریز کر دیا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

کیا ہنسیں اب ہنسی کا نہیں نام تک
صبح بیٹھے تو روتے رہے شام تک

خدائے سخن میرؔ نے فرمایا:

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

اور کلیم عاجزؔ نے کہا:

شام بھی آنسو صبح بھی آنسو
کیا یہی گردشِ زمانہ ہے

لیکن یہ دونوں بڑے جگر گردے کے انسان ہیں، یہ جینے کا فن جانتے ہیں، انہیں جینے کا سلیقہ ہے اور اس سلیقہ نے انہیں غم کا پہاڑ اٹھا کر جینے کا حوصلہ دیا۔

میرؔ کہتے ہیں:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اور عاجزؔ کہتے ہیں:

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گذری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

غرض حالاتِ زندگی اور شاعری کے پس منظر کے اعتبار سے میرؔ اور عاجزؔ دونوں میں بڑی یکسانیت ہے اور اسی یکسانیت کے سبب دونوں کی شخصیت، طبیعت اور مزاج میں بھی یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ میرؔ اپنے کو لیے دیئے رہتے تھے۔ ان کے اندر حد درجہ غیرت اور خودداری تھی۔ وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ عاجزؔ بھی اپنے آپ کو لیے دیئے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بھی حد درجہ غیرت اور خودداری ہے۔ یہ بھی کسی سے جلد متاثر نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں:

ناز کیوں نہ کریں دولت خودداری پر
ہم نے اے وقت ترے ہاتھ سے چھینا ہے یہی

میرؔ تثلیث اردو شاعری (میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ) کے ایک اہم رکن ہیں، وہ اردو شاعری کی آبرو اور خدائے سخن کہے جاتے ہیں، ان کا ایک منفرد اور بے مثل اسلوب بیان ہے، ان کے اسلوب شاعری اور اندازِ بیان کی پیروی کی کوشش ہر دَور میں کی گئی، حتیٰ کہ غالبؔ جیسے عظیم فنکار نے بھی ان کی پیروی کی کوشش کی؛ لیکن بقول ذوقؔ:

نہ ہوا، پر نہ ہوا، میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

دراصل میرؔ کی پیروی کرنے اور ان کے رنگ کو اپنانے کے لیے ان کی طرح پے در پے غموں سے دوچار ہونا بھی ضروری ہے، جس نے میرؔ کو ایک دردمند اور حساس دل عطا کیا اور دردمندی نے ان کے لہجہ ولب میں ایک خاص قسم کا گداز بھر دیا؛ اس لیے علامہ جمیلؔ مظہری نے فرمایا:

’’میرؔ کی یہ میراث خاص تو خالق نطق نے ایک ایسے نوجوان کے لیے وقف کر رکھی تھی، جو اپنی افتادِ طبع ہی کے لحاظ سے نہیں، میرؔ کی خانگی، معاشرتی، سماجی اور ان کے عہد کے سیاسی حالات کی مشابہت کے اعتبار سے بھی میرؔ کے تاثرات تغزل کا حامل ہونے والا تھا‘‘۔

غرض کلیم عاجزؔ اور میرؔ کے فن میں جو مماثلت اور مشابہت ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں کے حالات زندگی میں قدرے یکسانیت ہے۔ دونوں ہم کیفیت، ہم خیال، ہم حال اور ہم مزاج ہیں۔ کلیم عاجزؔ خود بھی کہتے ہیں:

’’میرؔ سے کسی قدر جو مشابہت ہے، یہ مشابہت فن سے نہیں، زندگی سے آئی ہے‘‘۔

اب ہمیں کلیم عاجزؔ اور میر تقی میرؔ کی شاعری کا بغور مطالعہ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ دونوں میں کتنی مشابہت ہے اور یہ کس نوعیت کی ہے؟

جب ہم دونوں کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو پاتے ہیں کہ دونوں غزل کے شاعر ہیں، ویسے تو دونوں نے دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے؛ لیکن ان کا اصلی جوہر غزل ہی میں نمایاں ہوتا ہے اور دونوں بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں۔ میرؔ کہتے ہیں:

کئی عمر در بند فکر غزل
سو اس فن کو اتنا بڑا کر چلے

اور دَورِ حاضر کے میرؔ کلیم عاجزؔ غزل پر کفر اور قتل کا فتویٰ صادر ہونے اور اسے 'نیم وحشی' کا خطاب ملنے کے باوجود اس کے کاکل و گیسو کو بڑی محبت اور انہماک کے ساتھ سنوار رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

کرتے رہو غزل میں جگر کے لہو کی بات
اس سرخرو سے بڑھ کے ہے کس سرخرو کی بات

دوسری جگہ اس کافر صنف سخن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

آرام سے چھپ جائے ہے پردے میں غزل کے
وہ آگ جو سینے میں چھپائے نہ بنے ہے

❀

زلف و رُخ کی انجمن میں کیا نہیں ؟
باہر آداب غزل کے جائیں کیا ؟

غزل کے حامی وطرفدار اور غزلیہ شاعری کے علم بردار کلیم عاجزؔ بھی خود کو میرؔ کی طرح غزل گو شاعر تسلیم کرتے ہیں:

جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اسے غزل میں ڈھالا
یہی دَردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

دراصل غزل ایک ایسی صنف سخن ہے، جس میں دل کے زخم اور جگر کے لہو کی بات کی جاتی ہے اور یہ خیالات، احساسات، جذبات اور تاثرات کی نزاکت اور لطافت کا پوری طرح ساتھ دے سکتی ہے، چوں کہ میرؔ اور عاجزؔ، دونوں دل کے زخم اور جگر کے لہو کی بات کرنا چاہتے ہیں؛ اس لیے دونوں بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔

میرؔ اور عاجزؔ کی ایک اور یکساں اور مشترک خوبی یہ ہے کہ دونوں کا مسلک محبت ہے، دونوں محبت کے علمبردار ہیں اور دونوں محبت کے نام لیوا ہیں۔ محبت دونوں کی گھٹّی میں پڑی ہوئی ہے۔ میرؔ کے والد صوفی مَنِش انسان تھے۔ وہ میرؔ کو برابر نصیحت کیا کرتے تھے:

''اے بیٹے عشق اختیار کر کہ اس کارخانے میں اس کا تصرّف ہے''۔

ڈاکٹر جمیل جالبیؔ فرماتے ہیں:

''عشق ان کی (میرؔ کی) شاعری کی تخلیقی روح ہے اور اس سے ان کی سیرت وشخصیت کی تعمیر ہوئی ہے''۔

(''محمد تقی میر''، از: جمیل جالبی)

کلیم عاجزؔ کی زندگی کا مسلک بھی عشق ہی ہے۔ انہوں نے محبت کرنے والوں اور محبت کے لیے جان دینے والوں کے بیچ پرورش پائی۔ ان کے والد نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی موت کے غم میں گھل گھل کر جان دے دی۔ ان کے نانا جو اپنے بھائی پر جان چھڑکتے تھے اور دونوں کی محبت اپنی مثال آپ تھی۔ ایک دن بھائی کی موت کی خبر سن کر گر پڑے اور مفلوج ہوگئے اور پھر چند دن بیمار رہ کر رخصت ہوگئے۔ ان کے چچا سید کبیر اپنی بیگم کی موت کی خبر سن کر گھر لوٹے اور ان کے بستر پر

لیٹ گئے اور پھر دوسرے، یا تیسرے دن مر کر ہی اُٹھے۔ کلیم عاجزؔ خود اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''ان شخصیتوں کی چھاؤں میں، ان محبت کرنے والوں اور محبت پر جان چھڑکنے والوں کے سائے میں میرے شعور نے آنکھیں کھولیں اور ان ہی سے میں نے بھی محبت کیا اور محبت پر جان چھڑکنا سیکھا اور ایسا سبق سیکھا کہ کبھی نہ بھولا''۔

(''وہ جو شاعری کا سبب ہوا......'')

غرض میرؔ اور عاجزؔ کا ایک نقطۂ اشتراک یہ بھی ہے کہ دونوں کے خمیر میں محبت ہے اور دونوں محبت کو اپنا شعارِ زندگی سمجھتے ہیں اور انہیں دنیا میں ہر طرف عشق ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

❀

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

❀

محبت سے ہی انتظامِ جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں

❀

اور پھر محبت کے متعلق اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

کچھ حقیقت نہ پوچھ کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

❀

کلیم عاجزؔ بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ محبت ان کی گھٹّی میں داخل ہے۔

بے تامل کود پڑتے ہیں وفا کی آگ میں
ہم ہیں اس مٹی سے جس مٹی سے پروانہ بنا

❀

اور دوسری جگہ اپنے مسلک کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

مرنا جینا ہو محبت کے لیے اس کے سوا
اور کیا ہے کہ جسے حسنِ عمل کہتے ہیں

❀

کر نہ سکیئے محبت تو مر جایئے
زندگی کام کی ہے اسی کام تک

❀

اور پھر اپنی ذات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

کچھ نہیں رکھتے محبت کے سوا
ہم غریبوں کی یہی اوقات ہے

❀

میرؔ اور عاجزؔ اس معاملے میں بھی ایک دوسرے سے مشابہت اور مماثلت رکھتے ہیں کہ دونوں خشک، تصوفانہ اور فلسفیانہ مضامین کو غزل کا ایسا خوبصورت دلنشیں پیراہن دیتے ہیں کہ تصوف کی عارفانہ خشکی اور فلسفہ کی ثقالت یکسر ختم ہوجاتی ہے؛ یعنی خشک اور دقیق مضامین بھی ان کے اشعار میں اس طرح جلوہ افروز ہوتے ہیں کہ ان میں غزل کی ساری نزاکت اور لطافت موجود ہوتی ہے اور وہ لطفِ غزل سے بھرپور ہوتے ہیں۔ یہ ایک مشکل اور دشوار گزار کام ہے؛ لیکن میرؔ اور عاجزؔ دونوں ہی اس فن میں طاق اور اپنی مثال آپ ہیں۔

علامہ جمیلؔ مظہری فرماتے ہیں:

''میرؔ کی پیروی میں عاجزؔ کو ایک اور سلیقۂ فن بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ میرؔ کی غزلیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عارفانہ اور فلسفیانہ افکار کو بھی بڑے سلیقے کے ساتھ غزل کا پیرایہ دیتے ہیں۔ وہ فلسفہ اور تصوف کے مضامین بھی بیان کرتے ہیں؛ لیکن اس طرح کہ نہ فلسفہ کی ثقالت باقی رہتی ہے، نہ تصوف کی عارفانہ خشکی.... غالبؔ نے ہر چند اس کی پیروی کی؛ مگر یہ سلیقہ غالبؔ کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ غالبؔ کے مدرسۂ فکر کے عظیم ترین نمائندے اقبالؔ بھی اس سے ہمیشہ محروم رہے۔ یہ فنکارانہ

چابکدستی اگر آئی تو کچھ داغؔ میں آئی اور داغؔ کے بعد عظیم آباد ہی کے ایک فنکار یگانہؔ چنگیزی ہیں۔ بیسویں صدی کے آخر نصف کے غزل گویوں میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ نام کلیم عاجزؔ کا ہے، جو بڑے بڑے مسائل کو بھی گھلا کر غزل کا میٹھا رس بنادیتے ہیں اور بڑی ذمہ داری سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے آج اس سلیقۂ فن میں کوئی ان کا شریک نظر نہیں آتا''۔

غرض میرؔ کی طرح کلیم عاجزؔ کو بات کہنے کا سلیقہ ہے۔ وہ اپنے عہد کی سیاسی باتیں بھی غزل کے پیرایہ میں اس خوبیٔ فن سے بیان کرتے ہیں کہ غزل کی لطافت اور نزاکت کا دامن کہیں سے بھی نہیں چھوٹتا۔

نقادِ اعظم کلیم الدین احمد کا کہنا ہے:

''کلیم عاجزؔ کو بات کہنے کا سلیقہ ہے.... ان کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی اور سیاسی باتیں غزل کی زبان میں ہیں''۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم ہیں بکھرے ہوئے جلووں کو سجانے والے
گیسوؤں والوں سے کچھ کم نہیں شانے والے

❀

میں اسیرِ حلقۂ دامِ وفا ہو ہی چکا
اب نہ ڈالو اپنی زلفوں میں شکن میرے لیے

❀

کچھ سجے ہیں زلف میں کچھ گلوئے یار میں
پھول جس قدر کھلے موسمِ بہار میں

❀

پھونک ڈالا ہے گلستاں کا گلستاں جس نے
کون کہتا ہے ترا شعلۂ رخسار نہیں

❀

امید ایسی نہ تھی محفل کے اربابِ بصیرت سے
گناہ شمع کو بھی جرم پروانہ بنا دیں گے

❁

شمع و پروانہ میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں
ہم جو محفل سے سنا کر اپنا افسانہ چلے

❁

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

❁

نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ
درازیٔ مستیٔ گیسوئے یار تو دیکھو

کلام میرؔ اور مجموعۂ عاجزؔ کا مطالعہ کرنے سے ایک اور بات جو دونوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور یکساں نظر آتی ہے، وہ ہے دونوں کا لب ولہجہ اور اسلوبِ بیان۔ اس معاملے میں دونوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے، لہٰذا اگر کوئی کلیم عاجزؔ کے اشعار کو میرؔ کے دیوان میں شامل کر لے تو پھر ان کی شناخت اور تفریق مشکل ہو جائے۔ اس ضمن میں علامہ جمیلؔ مظہری فرماتے ہیں:

''(کلیم عاجزؔ) میرؔ کے رنگ سخن میں ایسے اشعار کہنے لگے ہیں کہ میرؔ کے دیوان میں کوئی انہیں شامل کر دے تو بڑے بڑے مدعیاں فکر ونظر کو یقین ہو جائے کہ میرؔ کے اشعار ہیں''۔

میرؔ کی شاعری میں جو سوز وگداز، لہجے کی غمناکی اور زبان کا سہل پن پایا جاتا ہے، وہ کلیم عاجزؔ کی شاعری میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کلیم عاجزؔ کی شاعری کا سوز وگداز اور لب ولہجے کی غمناکی ملاحظہ فرمایئے:

کلیجہ تھام لو روداد غم ہم کو سنانے دو
تمھیں دُکھا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دکھانے دو

❁

زمانہ صبر کر لیتا ہے عاجزؔ ہم بھی کر لیں گے
خلش دل کی مٹا لینے کو دو آنسو بہانے دو

❁

ادا کیوں کر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ
بہت دشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

❁

نہ پوچھا کبھی حالِ دل تم نے ورنہ
وہ قصہ سناتے کہ تم یاد کرتے

❁

جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اسے غزل میں ڈھالا
یہی درد سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

❁

پہلو میں ہمارے دل کیسا دل پر تو قیامت بیت گئی
مرجھایا ہوا اک غنچہ ہے ٹوٹا ہوا اک پیمانہ ہے

❁

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
بس یہی دعا میں کروں ہوں اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے

❁

میں کیا سناؤں حالِ دل اب قابلِ بیاں نہیں
زخم کدھر کدھر نہیں دردِ کہاں کہاں نہیں

❁

کلیم عاجزؔ کو شعوری طور پر میرؔ کی طرح اپنی غزل کی دردمندی اور غمناکی کا احساس ہے؛ اس لیے کہتے ہیں:

تری محفل میں کس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میرؔ سے کچھ کم نہیں پیارے

میرؔ اور عاجزؔ میں صرف سوز و گداز اور دردمندی تک ہی یکسانیت نہیں؛ بلکہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس بیسویں صدی کے عاجزؔ کی زبان اُٹھارہویں صدی کے میرؔ کی زبان سے لب و لہجہ اور الفاظ کی نوعیت کے اعتبار سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے۔ علامہ جمیلؔ مظہری فرماتے ہیں:

"کلیم عاجزؔ کا دماغ میرؔ کے کیفیاتِ سخن سے اتنا مسحور ہوا ہے کہ انہیں میرؔ کے عہد کی پرانی زبان بھی اچھی لگنے لگی ہے"۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا جانے تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے
ہم کو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے
کب تک سنیں عاجزؔ سے غمِ دل کی حکایت
کم بخت ہمیشہ یہی افسانہ کہے ہے

❁

پڑھنے کو غزل عاجزؔ محفل میں جب آئے ہے
اپنے بھی وہ روئے ہے ہم کو بھی رُلائے ہے
کیا کھیل محبت بھی کھیلے ہے کھلائے ہے
ہارے ہے سو جیتے ہے کھوئے ہے سو پائے ہے

❁

زنجیریں کیا ہاتھ آئی ہیں مچلو ہو اتراؤ ہو
جب چاہو ہو کھولو ہو جب چاہو ہو پہناؤ ہو

❁

غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگادے ہے

❁

سوچوں ہوں تو میں سوچ کے رہ جاؤں ہوں حیران
کیا تم کہو ہو کیا دلِ پروانہ کہے ہے

❁

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجزؔ دیوانے ہو جاؤ ہو

❁

میرؔ کے اندازِ بیاں میں حد درجہ سادگی اور روانی ہے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں کہیں کہیں گفتگو کا سا لہجہ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً:

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

❁

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

❁

سادگیٔ زبان اور روانیٔ بیان کے سبب کلیم عاجزؔ کے یہاں بھی گفتگو کا سا انداز پایا جاتا ہے۔
مثالیں ملاحظہ ہوں:

تم جب آؤ ہو غزل پڑھنے کلیمؔ
جاؤ ہو محفل میں سنّاٹا کئے

❁

محبت دل لگی جانو ہو پیارے
وہی جانے ہے دل جس کا لگے ہے

❁

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے
مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے

❁

کیا جانے تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے
ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے

❀

تم دوست ہو کیسے کہ دکھاؤ ہو دل دوست
دشمن کا بھی دل ہم سے دکھائے نہ بنے ہے

غرض کہ میرؔ کے اندازِ بیاں اور کلیم عاجزؔ کے اسلوب بیاں میں حد درجہ یکسانیت اور دونوں کے لب ولہجہ میں بہت زیادہ مشابہت ہے۔ یہی نہیں؛ بلکہ ان کے یہاں وہ سوز وگداز اور دردمندی وغمناکی بھی پائی جاتی ہے، جو میرؔ کا حصہ ہے۔ دَورِ حاضر کے مشہور ومعروف نقاد آل احمد سرور فرماتے ہیں:

’’آپ (کلیم عاجزؔ) نے میرؔ کی زبان استعمال کر کے بھی یہ واضح کر دیا کہ لب ولہجے، معنی کی گونج اور شیرینی کی وجہ سے میرؔ کی زبان کے امکانات خصوصاً قدیم زبان کے امکانات کو آج بھی خوش اسلوبی سے برتا جا سکتا ہے‘‘۔

کنہیالال کپور کہتے ہیں:

’’کلیم عاجزؔ دَورِ جدید کے پہلے شاعر ہیں، جنہیں میرؔ کا انداز نصیب ہوا ہے، ان کی غزلوں کے تیور نہ صرف میرؔ کی بہترین غزلوں کو یاد دلاتے ہیں؛ بلکہ ہمیں اس سوز وگداز سے بھی روشناس کراتے ہیں، جو میرؔ کا خاص حصہ تھا‘‘۔

لیکن یہاں اس بات کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ میرؔ اور عاجزؔ کی شاعری میں یک رنگی ہونے کے باوجود عاجزؔ کے کلام میں میرؔ سی قنوطیت نہیں پائی جاتی ہے؛ بلکہ محمود عالم مدیر ماہنامہ ’’رفیق‘‘، پٹنہ کے لفظوں میں:

’’اگر ان کے لہجے میں اپنے نام کی مناسبت سے ایک طرف سوز وگداز، عاجزی اور انکساری ہے تو دوسری طرف نشتر زنی اور ضربِ کلیمی بھی موجود ہے‘‘۔

علامہ جمیلؔ مظہری اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’کلیم عاجزؔ اپنی کیفیاتِ تغزل میں میرؔ کے فرماں بردار پیرو تو ہیں؛ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ان کے دائرہ فن میں میرؔ کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں، ان کی غزلوں میں تغزل جدید کا پرتو ملتا ہے، ان کے انداز بیان میں نہ سہی، ان کے اندازِ فکر میں بھرپور ندرت اور بھرپور جدت ہے۔ اندازِ فکر میں جدّت اور انداز بیان میں قدامت کلیم عاجزؔ کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے‘‘۔

کلیم عاجزؔ اور میرؔ کی غزلوں کا لب ولہجہ بھی ایک خاص مطالعے کی چیز ہے۔ کلیم عاجزؔ اور میرؔ دونوں کے لہجے میں جیسی اپنائیت، معصومیت، نرمیت اور مظلومیت ٹپکتی ہے، وہ دراصل ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ انسان کے لب ولہجے پر اس کی شخصیت خاص طور سے اثر انداز ہوتی ہے۔ سوداؔ کے لہجے میں جو بلند آہنگی اور میرؔ کے لہجے میں جو شکستگی ہے، وہ دراصل سوداؔ اور میرؔ کی متضاد شخصیت ہی کی دین ہے۔ میرؔ کی زندگی برباد اور شکستہ ہے، لہٰذا ان کے لب ولہجہ میں شکستگی ہے، سوداؔ مست حال اور بلند مزاج ہیں، لہٰذا ان کے لہجے میں بلند آہنگی اور تندی ہے۔ کلیم عاجزؔ کی زندگی بھی میرؔ کی طرح شکستہ ہے؛ اس لیے ان کے لہجے میں بھی شکستگی ہے۔ دونوں ہم حال اور ہم مزاج ہیں؛ اس لیے ہم زبان اور ہم لہجہ بھی ہیں۔

میرؔ کہتے ہیں:

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

کلیم عاجزؔ فرماتے ہیں:

سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی
ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی

لیکن یہاں یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ میرؔ اور عاجزؔ میں لہجے کی یکسانیت کے باوجود ایک بنیادی فرق ان دونوں کے لہجوں میں پنہاں مجموعی تاثر کا ہے۔ میرؔ کے لہجے میں شکستگی کے ساتھ یاسیت، احساس محرومی اور غمِ بیزاری بھی ہے، جب کہ کلیم عاجزؔ کے لب ولہجہ میں شکستگی تو ضرور ہے؛ مگر اس میں قنوطیت اور یاسیت نہیں ہے؛ بلکہ ایک قسم کی شگفتگی اور رجائی رنگ ہے۔ وہ غموں سے بیزار نہیں؛ بلکہ لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں، یہاں بھی میرؔ اور عاجزؔ کی شخصیت کارفرما ہے۔

میرؔ علاحدگی پسند اور جلوت بیزار تھے، لہٰذا وہ یہاں بھی بیزار نظر آرہے ہیں اور اس سے نجات چاہتے ہیں، جب کہ کلیم عاجزؔ زندگی کے مصائب سے فرار نہیں پسند کرتے؛ بلکہ وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلنا پسند کرتے ہیں۔ آپ میرؔ اور عاجزؔ دونوں کے مذکورہ اشعار پر غور کیجئے۔ غموں نے میرؔ کی عمارت ڈھادی ہے؛ یعنی میرؔ نے غموں سے شکست قبول کر لی ہے۔ اس کے برعکس کلیم عاجزؔ کے یہاں سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی ہلکی ہلکی صدا آرہی ہے؛ یعنی انہوں نے

غموں سے شکست قبول نہیں کی ہے؛ بلکہ وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ حوصلہ اور یہ جگر میرؔ کو حاصل نہ ہو سکا۔

ذرا کلیم عاجزؔ کا غموں سے لطف اندوزی کا انداز ملاحظہ ہو:

زخموں نے وہ گلزار کھلایا ہے جگر میں
جچتی نہیں اب کوئی بہار اپنی نظر میں

❁

بجھنے کا خیال آتا ہی نہیں روشن جو ہوئے اک شام سے ہم
تکلیف سلگنے ہی تک تھی جلتے ہیں بڑے آرام سے ہم

❁

تجھے سیر کی ہے ہوس تو آ، کہ یہی تو سیر کا وقت ہے
مرا دَرد بھی ہے شباب پر مرا زخم بھی ہے نکھار پر

❁

وہ رہیں صاحب ملک دار و رسن
ہم بھی اپنے زمانے کے منصور ہیں

❁

اپنے ستم کا اور کچھ معیار کیجئے بلند
دار و سن میں اب کوئی لذّتِ امتحاں نہیں

❁

سنا ہے عشق کی معراج پنہاں ہے شہادت میں
چھری لاؤ ہمیں بھی اپنی قسمت آزمانے دو

❁

کلیم عاجزؔ کی غزلوں کے لہجے کا مجموعی تاثر ہماری زندگی میں مایوسی، غمِ بیزاری اور پژمردگی نہیں پیدا کرتا؛ بلکہ جینے کا ایک نیا حوصلہ اور ایک مضبوط جگر عطا کرتا ہے۔ اس سے ایک شکستہ انسان کو بے حوصلگی اور احساس محرومی نہیں؛ بلکہ غموں سے لطف اندوز ہونے اور زندگی کی صعوبتوں کو

خنداں جبینی سے برداشت کرنے کا سلیقہ ملتا ہے، حوصلہ ملتا ہے۔ یہ ایک بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ کلیم عاجزؔ اس پہلو سے یقیناً میرؔ سے برتر ہیں اور ان کا پایہ بلند ہے۔

المختصر میرؔ اور کلیم عاجزؔ کی زندگی اور ان کے فن و اسلوب بیان میں قدرے مماثلت ہے، دونوں کی شاعری میں بلا کا دَرد اور غم موجود ہے۔ دونوں کے لب و لہجے میں حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ دونوں کی زبان سہل اور شاعری سہل ممتنع ہے۔ دونوں کے یہاں فلسفیانہ، مفکرانہ اور تصوفانہ خیالات غزل کے دلکش پیراہن میں اس طرح جلوہ گر ہوئے ہیں کہ ان میں لطف غزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دونوں بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں۔ دونوں کے خمیر اور سرشت میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ان تمام مماثلتوں اور یکسانیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم کلیم عاجزؔ کو دَورِ حاضر کا میرؔ بھی ایک بلند مرتبت شاعر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

❁

دیگر اصنافِ شاعری

کلیم عاجزؔ خصوصی طور سے غزل کے شاعر ہیں۔ انہیں تمام اصنافِ شاعری میں سب سے محبوب، پسندیدہ، مکمل اور بہترین صنفِ سخن، غزل ہی معلوم ہوتی ہے، لہٰذا وہ ابتدا سے اب تک غزل ہی کے کاکل و گیسو کو سجا رہے ہیں اور اس کے جلال و جمال کو نکھار رہے ہیں۔

غزل کے علاوہ کلیم عاجزؔ دوسری اصنافِ شاعری کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں؛ کیوں کہ غزل ان کی نظر میں تمام اوصافِ شاعری سے آراستہ ہے۔ اس میں تمام تر خیالات و احساسات کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت ہے، حالاں کہ غالبؔ نے غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا تھا کہ!

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مری بیاں کے لیے

لیکن کلیم عاجزؔ اسے مکمل وسیع اور جامع صنف تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اسی پر قناعت کرتے ہیں۔

زُلف و رُخ کی انجمن میں کیا نہیں
باہر آدابِ غزل کے جائیں کیا

لیکن غزلوں کے علاوہ کبھی کبھی عاجزؔ نے دوستوں کی فرمائش پر بقدرِ ضرورت دوسری اصناف مثلاً نظم، نعت (بارگاہِ رسالت میں التجا)، رباعی اور سہرا وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے جن کا نہایت ہی مختصر بیان مندرجہ ذیل ہے۔

(الف) نظم نگاری

یوں تو تمام اصنافِ سخن کو عرفِ عام میں نظم کہا جاتا ہے؛ لیکن اصطلاحِ شاعری میں نظم اس مجموعہ اشعار کو کہیں گے، جس میں تسلسل خیال اور ارتقائے خیال پایا جاتا ہے۔ اس کا کوئی مرکزی خیال ہوتا ہے اور اس کے مطابق اس کا کوئی عنوان بھی ہوتا ہے۔ شاعر کے خیالات مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں۔ غزل اور قصیدے کی طرح نظم کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں۔ اسے کسی بھی ہیئت میں لکھا جا سکتا ہے۔ دَورِ جدید میں انگریزی ادب کے اثر سے نظم معری (قافیہ کی پابندی سے آزاد) اور نظم آزاد (مصرعوں میں ارکان کی تعداد کی برابری کی پابندی سے آزاد) بھی وجود میں آئی ہیں؛ لیکن ہمیں یہاں ان نظموں سے بحث مقصود نہیں ہے؛ کیوں کہ کلیم عاجزؔ کے یہاں اس طرح کی نظموں کا وجود ہی نہیں ہے۔

کلیم عاجزؔ نے اب تک جو بھی نظمیں کہیں، وہ کسی نہ کسی کی فرمائش، یا کسی پروگرام میں شرکت کرنے کی غرض سے کہی ہیں۔ ان کی زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں، جو یومِ جمہوریہ کے دن لال قلعہ (دلّی) کے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کہی گئی ہیں اور ایسی نظموں کا عنوان عموماً ''جشنِ آزادی'' ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی دوسرے مواقع اور ضرورت کے تحت نظمیں کہی گئی ہیں، جن کی تعداد کم ہے۔ مثلاً ان کی پہلی نظم 'اقبال' جو انہوں نے ۱۹۴۰ء میں بی. این. کالج کے انعامی مقابلے میں شریک ہونے کی غرض سے کہی تھی۔ اس کے بعد ایک منظوم قطعہ اپنے ہم زُلف معین الدین احمد عرف کجو مرحوم (جو جمشید پور میں فساد میں مارے گئے) کے لیے ۱۹۷۹ء میں لکھا تھا، جس کا پہلا شعر اس طرح تھا۔

بڑی مدت پہ پھر چھیڑی ہے شرحِ آرزو میں نے
اگرچہ ترک کر رکھی تھی رسمِ گفتگو میں نے

کلیم عاجزؔ کی نظموں کی نمایاں خصوصیت اس کا غزلیہ رنگ و آہنگ ہے۔ ان کی نظمیں اپنی ہیئت کے اعتبار سے نظم تو معلوم ہوتی ہیں؛ لیکن ان کا اندازِ بیاں اور اس میں لفظوں کا انتخاب ایسا ہوتا ہے، جو انہیں غزل سے بے حد قریب کر دیتا ہے۔ اس کے اندر بھی ہمیں بہار، خزاں، ساقی، جام اور میکدہ، پیمانہ، مئے، لالہ وگل، نسرین ونسترین وغیرہ جیسے الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں، گویا چوں کہ کلیم عاجزؔ بنیادی طور سے غزل کے شاعر ہیں؛ اس لیے جب وہ نظمیں بھی کہتے ہیں تو ان میں غزل

سارنگ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

نظم کی ایک اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ اس کے اشعار میں مکمل ربط ہو اور خیالات مسلسل ارتقا پذیر ہوں۔ نظم میں پیش کردہ خیالات نظم کے مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں؛ اس لیے نظم کو ایک پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے، جس کی تمام پنکھڑیوں میں باہمی ربط ہوتا ہے اور تمام پنکھڑیاں مل کر پھول کو خوبصورتی اور اکملیت عطا کرتی ہیں۔ اگر اس پھول کی ایک پنکھڑی الگ کر لی جائے تو اس پھول کا حسن کھو جاتا ہے اور اس کی پنکھڑیوں کے بیچ خلا پیدا ہو جاتا ہے؛ اس لیے نظم کے اشعار کے بیچ کوئی کھانچ، یا خلا نہیں ہونا چاہیے، اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ نظم کا عیب ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نظموں کی انفرادیت، یا عیب یہ ہے کہ ان کی نظموں میں ارتقائے خیال نہیں پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی نظموں کے اشعار میں باہمی ربط اور باہم پیوستگی نہیں ہوتی ہے اور ان کے اشعار بھی غزل کی طرح دوسرے اشعار سے لاتعلق اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم 'سائیاں' کے دوسرے بند کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کلیم آ کہ چلتی ہیں پروائیاں   سنا کوئی تازہ غزل سائیاں
تو سائیں ہے اور سائیں کی جھولی میں   چھپی ہیں بہت بزم آرائیاں
میں کیا حال ان کا بتاؤں تجھے؟   دکھاتے پھرے ہیں جو مرزائیاں
حقیقت میں ہے مال سستا مگر   بڑھاتے ہیں پیکنگ پے مہنگائیاں
لفافے ہیں لمبے مضامین سبک   غزل ہو کہ نظمیں کہ چوپائیاں
لٹی جائے ہے آبروئے سخن   بڑھی جائے ہے فن کی رسوائیاں
اب ایسے میں کاہے تو خاموش ہے   سنا سائیاں کچھ سنا سائیاں
محقق نہ ہم کوئی نقاد ہیں   مبارک انہیں کو ہو چتورائیاں
میاں بس ہمیں تو پسند آ گئیں   تری سادگی تیری سچائیاں
ترے طرز و اسلوب و انداز کو   دعا دیتی ہیں دل کی گہرائیاں

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس نظم میں، نظم کے اصول کے مطابق ارتقائے خیال، یا ربط خیال نہیں ہے؛ بلکہ اس کے اشعار غزل کی طرح موضوع کے اعتبار

سے جداگانہ اور اپنے آپ میں مکمل ہیں، لہٰذا ان کی ترتیب بدل دینے سے نظم کے مفہوم و مطلب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ ان اشعار کو اگر مجموعہ غزل میں شامل کر دیا جائے تو کوئی شناخت نہیں کر سکتا کہ یہ نظم کے اشعار ہیں۔

کلیم عاجزؔ کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ تو بہت ہی مختصر ہوتی ہیں اور نہ ہی بہت طویل ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں عموماً بیس سے تیس اشعار پر مشتمل ہوتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم 'ڈوب مرنے کا مقام آیا' ۲۰ اور 'جشن آزادی' ۲۰، اشعار پر مشتمل ہے۔

کلیم عاجزؔ اپنی نظموں میں شعوری طور پر سادہ، سہل، عام فہم، خوبصورت اور برجستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور وہ زبان و بیان کے معاملے میں اتنے ہی محتاط نظر آتے ہیں، جتنے کہ غزل میں۔ ان کی نظموں میں ایک مخصوص قسم کی سادگی اور ایک خاص متغزلانہ رنگ ہے، جو انہیں دوسرے نظم نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بڑی سلاست اور روانی ہوتی ہے۔ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکے بعد دیگرے اشعار خود بخود باہم چسپاں ہوتے جا رہے ہیں اور الفاظ کا دریا اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ پوری نظم سلاست، بلاغت اور روانی کی تصویر ہوتی ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نظموں میں طنز نگاری بھی ایک نمایاں وصف ہے، جس طرح ان کی غزلوں میں ایک مخصوص طنزیہ رنگ ہے، اسی طرح ان کی نظموں میں بھی طنز کے تیر و نشتر ملتے ہیں اور اس طنز کی نوعیت غزل کی طنز سے الگ اور منفرد ہے۔ یہ طنز تلخ اور براہِ راست ہے اور اس کا انداز وہی ہے، جو مسدّسِ حالی میں حالیؔ کا ہے۔ نظم 'مسافر' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گو شیخ زادے اور برہمن پسر ملے
سب آستین دراز ملے کم نظر ملے
جتنے رفاہِ عام کے پیغامبر ملے
خود بیں و خود نواز ملے خود نگر ملے
اربابِ ذی وقار کا تو پوچھنا ہی کیا
جتنے بلند بام ملے تنگ در ملے

❀

نظم 'جشنِ آزادی' کے ایک بند میں طنز کا تیور ملاحظہ ہو:

اربابِ میکدہ یہ امامانِ بادہ نوش
یہ دشمنِ جنوں یہ پرستارِ عقل و ہوش
گندم نما یہ دوست یہ احباب جو فروش
باطن سیاہ کار بظاہر سفید پوش
یہ تاجرانِ لالہ و گل تیغ در بغل
دیتے ہیں زخم کرتے ہیں فرمائشِ غزل

❀

المختصر غزلیہ رنگ، عدمِ ارتقائے خیال، سادہ و دلنشیں زبان، سلاست و روانی، طنزیہ اندازِ بیان اور صالح قدروں کی ترجمانی کلیم عاجزؔ کی نظموں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

(ب) رباعی

رباعی اردو کی ایک قدیم صنف ہے۔ عربی میں رباعی کے معنی چار ہوتے ہیں، چوں کہ یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے؛ اس لیے اس مناسبت سے چار مصرعوں کی نظم کو رباعی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک ہی مضمون جو عموماً اخلاقی، یا عشقیہ ہوتا ہے، بیان کیا جاتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے رباعی کا چوتھا؛ یعنی آخری مصرع اصل، برجستہ اور فنکارانہ ہوتا ہے۔ مثلاً:

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

کلیم عاجزؔ نے ابتدائے شاعری میں چند رباعیات بھی کہی ہیں اور یہ رباعیاں وہ عموماً مشاعروں میں غزل سنانے سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ آج سے کچھ عرصے پہلے عام طور سے یہ رواج تھا کہ شعرا اپنی تخلیق سنانے سے قبل ماحول بنانے کے لیے ایک، یا دو رباعیاں پڑھا کرتے تھے،

چناں چہ کلیم عاجزؔ نے بھی اسی ضرورت اور روایت کے تحت ابتدا میں چند رباعیاں کہی تھیں، جو عام شاعرانہ رنگ کی ہیں؛ لیکن اس میں بھی لہجے کی غمناکی اور بیان کی سادگی نمایاں ہے۔ ان کی ایک رباعی جو اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی:

اشعار میں غم سنا رہا ہے کوئی
فریاد کی لے میں گا رہا ہے کوئی
ہیں ساز پہ انگلیاں بظاہر لیکن
دُکھتی ہوئی رگ دبا رہا ہے کوئی

کلیم عاجزؔ کی رباعیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں اور نوعیت کے اعتبار سے سب اسی رنگ کی ہیں۔

(ج) نعت گوئی

کلیم عاجزؔ نے نظم اور رباعیوں کے علاوہ مختلف حالات و حادثات سے متاثر ہو کر نعت بھی کہی ہیں، مثلاً فلسطین پر اسرائیلیوں کے قبضہ ہو جانے پر انہوں نے ایک نعت لکھی۔ ایک نعت سقوطِ ڈھاکہ؛ یعنی بنگلہ دیش کے قیام ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء سے چند روز قبل لکھی، وغیرہ وغیرہ۔

کلیم عاجزؔ کی ان نعتوں کو صحیح معنوں میں نعت کہنا غلط ہے؛ بلکہ ان کی نوعیت التماسی اور التجائی ہے۔ ان میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی پریشانیوں کا دُکھڑا سنا کر مدد کی درخواست کی گئی ہے، لہٰذا اسے 'التماس در بارگاہِ رسالت' کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نعت کی سب سے نمایاں خوبی اس کا درد و کرب ہے۔ پوری نعت ان کے دردِ دل کی ترجمانی کرتی ہے۔ لہجے کی افسردگی اور اندازِ بیان کی گھلاوٹ شروع سے آخر تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مصیبت کا مارا بڑے کرب کے ساتھ اپنی داستانِ غم سنا رہا ہے۔ بیان میں ایسی کشش اور تاثیر ہوتی ہے کہ سننے والے کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتا ہے اور اس کی ساری ہمدردیاں شاعر کے لیے مخصوص ہو جاتی ہیں۔

کلیم عاجزؔ کی نعت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہایت سادہ، سہل اور عام فہم الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ثقیل الفاظ اور دور از کار تراکیب سے قطعاً گریز کیا گیا ہے۔ پوری نعت سادگی و ستھرائی کی حسین تصویر نظر آتی ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نعت میں سلاست اور روانی ہے۔ اندازِ بیان گفتگو کا سا ہے، جس سے لہجے میں انفرادیت آ گئی ہے۔ کہیو اور رہیو وغیرہ کے استعمال نے زبان میں مانوسیت اور اثریت پیدا کر دی ہے؛ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلیم عاجزؔ نعت گوئی کے معاملے میں بڑی حد تک کامیاب اور دیگر نعت گو شعرا سے ممتاز ہیں۔ ان کی دو نعت کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

نعت (نالۂ نیم شبی)

(مولانا منت اللہ رحمانی، مونگیر، امیر شریعت بہار کی فرمائش پر لکھی گئی اور 'فلسطین کانفرنس' میں پڑھی گئی)

ان سے اے بادِ صبا حال ہمارا کہیو
غم سے تڑپے ہے کوئی دَرد کا مارا کہیو
ایک بھی ماجرا مت چھوڑیو سارا کہیو
کہہ کے اک بار نہ چپ رہیو دوبارا کہیو
ہم نہ جانے ہیں کوئی اور سہارا کہیو
جب کبھی چوٹ لگی ان کو پکارا کہیو
کل بھی ہم کون سا سرخاب کا پر رکھتے تھے
آج کیوں ہم سے کریں ہیں وہ کنارا کہیو
اب وہ آوارہ و حیران پھرے ہے جس نے
شاہد وقت کی زلفوں کو سنوارا کہیو
کل بھی تھا آج بھی ہے کل بھی رہے گا عاجزؔ
نام ان کا ہمیں جی جان سے پیارا کہیو

آخری شعر میں لہجے کی گھلاوٹ، محبت کی شدت، بات کی اثریت اور بیان کی سلاست اپنے کمال کو پہنچی نظر آتی ہیں۔ اس شعر میں کلیم عاجزؔ ایک 'عاشقِ رسولؐ' کی شکل میں مجسم و متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

نعت

(بنگلہ دیش کے قیام ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء سے چند روز قبل کہی گئی)

یہ بات صبا کہیو ان سے وہ جن کی کملیا کالی ہے
اب ان کے غلاموں کے گھر کی دیوار الٹنے والی ہے
کہیو کہ انہوں نے اپنی نظر کیوں ہم سے الگ فرمالی ہے
ہم نے تو انہیں کی زلفوں کی زنجیر گلے میں ڈالی ہے
کہیو کہ دلوں پر چھائی ہے ہر سمت شکستہ حالی ہے
دن بھی ہے بڑا سونا اور رات بھی کالی کالی ہے
کہیو کہ وہی تو ساقی ہے کہیو کہ وہ یہ بھی جانے ہے
رندوں کی لگی ہے پیاس بہت اور سب کا پیالہ خالی ہے

❀

طوالت کے خوف سے کلیم عاجزؔ کی دیگر اصنافِ شاعری سے متعلق یہ مضمون قدرے مختصر اور تشنہ ہے؛ لیکن پھر بھی اس مختصر سے تعارف سے ان کی دیگر اصناف کی فنی نوعیت اور ان کی ادبی حیثیت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عملاً اور مزاجاً غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی طبیعت اور ان کے ذہن کا فطری جھکاؤ اور رجحان صنف غزل ہی کی طرف ہے، لہٰذا ان کی دیگر اصنافِ سخن میں بھی غزلیہ رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے، جو زیر لب یہی کہتا نظر آتا ہے۔

زلف و رُخ کی انجمن میں کیا نہیں
باہر آدابِ غزل سے جائیں کیا

❀

نالۂ نیم شبی

(التماس دربارگاہِ رسالت)

زخم کھائے ہوئے سر تا بہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے یا شاہِ اُمم آئے ہیں
آپ کے سامنے جس حال میں ہم آئے ہیں
ایسے مجرم کسی دربار میں کم آئے ہیں
کھوکے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں
شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں
سر نگوں آئے ہیں بادیدۂ نم آئے ہیں
آبرو باختہ، دل سوختہ ہم آئے ہیں
عالَم عالَم میں کہیں کوئی سہارا نہ ملا
ٹھوکریں کھا کے ہر اک سمت کی ہم آئے ہیں
گرچہ بے سوز ہیں بے ساز ہیں بے ساماں ہیں
ہاتھ خالی نہیں سرکار میں ہم آئے ہیں
لے کے اردن کے جوانانِ بنی ہاشم کا
حوصلہ آئے ہیں دم آئے ہیں خم آئے ہیں
بیت مقدس کے غریب الوطنوں کا لے کر
جگر سوختہ و دیدۂ نم آئے ہیں
لے کے ہم پیشکش خدمتِ عالی کے لیے
تحفۂ خونِ شہیدانِ حرم آئے ہیں
مختصر یہ ہے کہ اس سینۂ سوزاں میں لیے
وقت کا سب سے دہکتا ہوا غم آئے ہیں

یہ غم ایسا ہے کہ پھر غم نہ کوئی یاد رہا
گرچہ ہر دَور میں رنج آئے ہیں غم آئے ہیں
آپ کے سایۂ دامن سے جو ہم دُور ہوئے
ٹوٹ کے چاروں طرف اہلِ ستم آئے ہیں
اور کہتے ہیں کہ تم لوگ اسی قابل ہو
اور آئیں گے مصائب ابھی کم آئے ہیں
اک نگاہِ کرم و عفو کے سائل بن کر
مجرمانِ اُمم اے شاہِ اُمم آئے ہیں
اب تو اس دَر سے نہ سر اُٹھے گا انشاء اللہ
جان دے دیں گے یہیں، سوچ کے ہم آئے ہیں

❀

دعا

رات جی کھول کے پھر میں نے دعا مانگی ہے
اور اک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے
اور وہ چیز نہ دولت نہ مکاں ہے نہ محل
تاج مانگا ہے نہ دستار و قبا مانگی ہے
نہ تو قدموں کے تلے فرش گہر مانگا ہے
اور نہ سر پہ کلاہِ بالِ ہما مانگی ہے
نہ سکندر کی طرح فتح کا پرچم مانگا
اور نہ مانند خضر عمر بقا مانگی ہے
نہ تو مہمان خصوصی کا شرف مانگا ہے
اور نہ محفل میں کہیں صدر کی جا مانگی ہے

میکدہ مانگا نہ ساقی نہ گلستاں نہ بہار
جام و ساغر نہ مئے ہوش ربا مانگی ہے
نہ تو منظر کوئی شاداب و حسیں مانگا ہے
نہ صحت بخش کوئی آب و ہوا مانگی ہے
محفلِ عیش نہ سامانِ طرب مانگا ہے
چاندنی رات نہ گھنگھور گھٹا مانگی ہے
بانسری مانگی نہ طاؤس نہ بربط نہ رباب
نہ کوئی مطربۂ شیریں نوا مانگی ہے
چین کی نیند نہ آرام کا پہلو مانگا
بخت بیدار نہ تقدیر رسا مانگی ہے
نہ تو اشکوں کی فراوانی سے مانگی ہے نجات
اور نہ اپنے مرَضِ دل کی شِفا مانگی ہے
نہ غزل کے لیے آہنگ نیا مانگا ہے
نہ ترنم کی نئی طرزِ ادا مانگی ہے
سن کے حیران ہوئے جاتے ہیں اربابِ چمن
آخرش کون سی پاگل نے دُعا مانگی ہے
آ ترے کان میں کہہ دوں اے نسیمِ سَحَری
سب سے پیاری مجھے کیا چیز ہے کیا مانگی ہے
وہ سراپائے ستم جس کا میں دیوانہ ہوں
اس کی زلفوں کے لیے بوئے وفا مانگی ہے

نثری تصانیف کا مختصر تعارف

کلیم عاجزؔ کی نثری تصانیف نثر نگاری کا نہایت دلکش اور معیاری نمونہ ہے۔ ان کی نثر میں بلا کا حسن، غضب کی اثر انگیزی اور صالح فکر و نظر کی کارفرمائی ہے۔ جس کے مطالعے کے درمیان قاری اس کی سحر انگیزی میں ڈوب جاتا ہے۔

کلیم عاجزؔ کی نثر نگاری پر خامہ فرسائی سے قبل ان کی نثری کتابوں کو ایک نظر ملاحظہ کریں:

۱۔ مجلس ادب، ۱۹۵۹ء، ۲۔ یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ، ۱۹۷۸ء، ۳۔ اک دیس اک بدیسی، ۱۹۸۹ء، ۴۔ جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ۱۹۸۲ء، ۵۔ ابھی سن لو مجھ سے، ۱۹۹۲ء، ۶۔ دفتر گم گشتہ، ۲۰۰۰ء، ۷۔ دیوانے دو، ۲۰۰۰ء، ۸۔ پہلو نہ دُکھے گا، ۲۰۰۴ء، ۹۔ میری زبان میرا قلم، ۲۰۰۵ء، (حصہ اوّل و دوم)، ۱۰۔ ہاں چھیڑ و غزل عاجزؔ...

ان دس تصانیف کے علاوہ پہلے مجموعۂ غزل 'وہ جو شاعری سبب ہوا۔۔۔' دوسرے مجموعے غزل 'جب فصل بہاراں آئی تھی۔۔۔' اور تیسرے مجموعۂ غزل 'ہاں چھیڑ و غزل عاجزؔ۔۔۔'، تینوں کے دیباچے جو سو سے سوا سو صفحات پر مشتمل ہیں، الگ الگ کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کلیم عاجز کی نثری تصانیف کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

۱۔ 'مجلسِ ادب'

یہ کتاب دراصل کلیم عاجزؔ کی پہلی تصنیف ہے جو 'مجلس ادب' کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مرتبین میں عطا کاکوی اور کلیم عاجزؔ دونوں کا نام ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری کتاب کلیم عاجزؔ نے مرتب کی ہے اور عطا کاکوی کا نام محض زیبائش کے لیے ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں کلیم عاجزؔ نے مجلس ادب کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور صوبہ بہار میں اس کی ضرورت و امکانات کا بھی محاکمہ کیا ہے۔ دوسرا حصہ کتاب کا اصل اور اہم حصہ ہے۔ اس کی حیثیت تاریخی اور دستاویزی ہے۔ اس میں کلیم عاجزؔ نے مجلس

ادب کے زیر اہتمام منعقدہ ۱۲ مجلسوں کی بڑی خوبصورت اور دلچسپ روداد لکھی ہے۔ ہر مجلس سے قبل صدر مجلس کی پوری تفصیل بیان کی ہے، پھر اس کے بعد مجلس کی روداد قلمبند کی ہے۔

کلیم عاجزؔ کی یہ تصنیف ایک بہترین تذکرہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں انہوں نے شعرا کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کا نمونہ کلام بھی شامل کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت نے کیسے کیسے شاعر پیدا کئے اور وہ پھر کس طرح وقت کے غبار تلے دب گئے۔ ان شاعروں میں ایک پیامیؔ عظیم آبادی بھی ہیں، جن کا ذکر اس تذکرہ میں شامل ہے۔ وہ عظیم آباد کے ایک صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں؛ لیکن عظیم آباد کے شاعر حضرات بھی ان سے واقف نہیں ہیں۔ ان کا پورا کلام کلّیات کی شکل میں مرتب شدہ ان کے صاحبزادے ابونصر فاروق صارمؔ عظیم آبادی، ساکن کھجوربنّہ، پتھر کی مسجد، پٹنہ کے پاس محفوظ ہے۔

کلیم عاجزؔ کی اس تصنیف کے مطالعے سے پٹنہ کے کچھ ذی حیثیت اور وضعدار اشخاص کے متعلق بھی ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہے۔ مصنف نے ہر مجلس کی روداد بیان کرنے سے قبل صاحب مجلس کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جس سے اس کی پوری شخصیت ہمارے سامنے زندہ ہوجاتی ہے۔ اس کے بیان میں کلیم عاجزؔ نے ایسی زبان اور ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ رودادِ مجلس بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں کلیم عاجزؔ کا قلم زعفران زار بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً پہلی مجلس کی روداد میں لکھتے ہیں:

> ''یک بیک رونے کی سی آواز آئی، سب لوگ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، غفران صاحب نے دروازہ کی طرف جھانکا کہ کسی ملازم کو مار تو نہیں پڑی۔ بعضوں نے کان کھڑے کئے کہ محلے میں کوئی چل تو نہیں بسا۔ پروفیسر عطا کاکوی نے سمجھا کہ شاید ہمسائے میں کسی لڑکے کو امتحان میں فیل ہوجانے کی خبر ملی ہے۔ حکیم صاحب کو یقین ہوگیا کہ میرا کوئی مریض رخصت ہوگیا۔ مختصر یہ کہ دو چار سکنڈ کے لیے سب کے وحشت میں کان کھڑے ہوگئے، پھر سب لاحول ولاقوۃ کہہ کر مسکرانے لگے۔ واقعہ یہ تھا کہ میں نے غزل شروع کردی تھی''۔

(''مجلس ادب''، صفحہ: ۴۵)

مختصر یہ کہ کلیم عاجزؔ کی یہ تصنیف ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کلیم عاجزؔ کے ہم عصر شعرا اور عظیم آباد کی چند اہم شخصیتوں کا نادر مرقع ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے، جس میں ہم یہاں کی چند وضعدار شخصیتوں کے اندر یہاں کی تہذیب کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور رودادِ مجلس کے مطالعے سے عظیم

آباد میں شعر و شاعری کی روایت اور یہاں کے باشندوں کے مذاق شعر و سخن کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں، چوں کہ یہ کتاب اب نایاب ہوچکی ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔

۲۔ 'یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ'

'یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ' کلیم عاجزؔ کا 'سفرنامۂ حج' ہے۔ یوں تو حج کے بہت سارے سفرنامے ہیں؛ لیکن ان سے موازنہ اور مقابلہ کی گنجائش نہیں؛ کیوں کہ اس کتاب کی ضخامت، زیادہ تفصیل کی اجازت نہیں دیتی ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تفصیل سے بچتے ہوئے صرف اس سفرنامے پر مرکوز رہا جائے۔

کلیم عاجزؔ کے اس سفرنامہ حج کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت دلچسپ اور دل پذیر انداز میں لکھی گئی ہے۔ اوّل تا آخر اس کی یہ دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ آپ پورے سفرنامے کو پڑھ جایئے، کہیں بھی دلچسپی کا فقدان نہیں ملے گا۔ بیان کی روایتی حلاوت، شیرینی، بے ساختگی اور دلکشی اس کتاب میں بھی برقرار ہے۔ کیفیات، خیالات و واقعات، الفاظ کے خوبصورت سانچے میں ڈھل ڈھل کر مجسم ہوتے چلے جاتے ہیں اور قاری ان میں پوری طرح جذب رہتا ہے۔

اس سفرنامے کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد قاری کو حج کی سعادت حاصل کرنے کی زبردست خواہش ہوتی ہے۔ یہ اس کتاب کی بڑی کامیابی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب حج کے سلسلے میں بہتر رہنمائی بھی کرتی ہے؛ یعنی جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے جارہے ہوں، ان کے لیے یہ کتاب بڑی مفید و مددگار ثابت ہوگی۔

حج کے سلسلے میں حاجیوں کو دو مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایک تو مناسک حج اور دوسرے قلبی واردات۔ کلیم عاجزؔ نے اپنی اس کتاب میں جس طرح مناسک حج کی تفصیل اور اس دوران کے اہم واقعات بیان کئے ہیں، اس سے زیادہ توجہ اور شعور کے ساتھ حج کے دوران کی روحانی کیفیات اور قلبی واردات کا ذکر کیا ہے۔ یہی وہ اہم پہلو ہے جو اس کتاب کو بڑی قیمتی اور گراں قدر بنا دیتا ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کے دل میں انہیں کیفیات و احساسات کو اُجاگر کردیتا ہے اور قاری تھوڑی دیر کے لیے اس میں اس طرح جذب ہوجاتا ہے کہ خود کو اسی ماحول اور اسی مقام پر محسوس کرتا ہے۔ مثلاً طواف کے دوران کی کیفیات کو جو خانۂ خدا پر نظر کرنے سے ان کے دل میں پیدا ہوئیں، ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''سنگ سیاہ کے ٹکڑے سفید مسالے سے جڑے ہوئے.... نہ صناعی ہے، نہ مینا کاری ہے.... نہ ان میں لعل و جواہر جڑے گئے ہیں.... لیکن ان کھردرے پتھروں میں

کیا نہیں ہے، جو دونوں جہاں میں ہے؟ ان کا جلال دلوں سے پوچھو۔ ان کا جمال نگاہوں سے دریافت کرو۔ ان کی طلب ان کی آرزو، ان کی محبت دیکھنا ہو تو سینے کے اندر جھانک کر دیکھو۔ ان سیاہ پتھروں کا حسن، دل آویزی، کشش ان کا تقدس دلوں کو محسوس ہوتا ہے۔ آنکھوں کو کیسا نظر آتا ہے، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کوئی مصور تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ کوئی شاعر تشریح نہیں کر سکتا۔ مجنوں کو سیاہ فام لیلیٰ میں جو نظر آتا ہے، کروڑوں انسانوں کو وہ ان سیاہ پتھروں میں نظر آتا ہے۔ یہ سب بیان کرنے کی باتیں نہیں، معنی والفاظ پہنانے کی بات نہیں، جس وقت ان سیاہ پتھروں کے قریب جاؤ گے اور یہ سوچو گے کہ یہ پتھر ان ہاتھوں سے جڑے گئے ہیں، جن کو خلیل اللہ کا خطاب ملا تھا، جن کے لیے نمرود نے دو میل کے حلقے میں آگ روشن کی تھی اور (جن کے لیے) آگ کے شعلے پھول بن گئے۔ ان ہاتھوں کا لمس ان پتھروں میں ہے۔ زندہ ہے۔۔۔۔ تو دل زور سے دھڑکنے لگے گا اور آنکھیں نمناک ہونے لگیں گی اور جب یہ سوچو گے کہ یہ پتھر وہ ہیں، جن سے لپٹ لپٹ کر سید المرسلین محبوبِ خداؐ روئے ہیں تو دل تھرانے لگے گا، ہونٹ کانپنے لگیں گے، روئیں کھڑے ہو جائیں گے اور جی چاہے گا کہ ان پتھروں پر سر رکھ کر سو جاؤں۔ میں جب طواف کرتا تو ایک ایک طواف میں بڑی دیر لگ جاتی۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا اور روتے روتے بُرا حال ہو جاتا اور کہتا جاتا کہ یا سیدنا چلنے کا حکم آپ دے گئے ہیں، چل رہا ہوں۔ اگر حکم ہوتا اور بس میں ہوتا تو آنکھوں کے پاؤں سے چلا جاتا اور ہونٹوں کے قدموں سے گزرا جاتا''۔

(صفحہ: ۴۰ تا ۴۳)

اس طرح کی بیشتر مثالیں اس سفرنامے میں عام ہیں۔ قاری اس کے مطالعے سے ایک خاص ایمانی اور روحانی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سفرنامہ جذبِ ایمانی اور کیف روحانی میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ مصنف بیشتر مقامات پر جذب و کیف کے ہاتھوں بے بس نظر آتا ہے۔

کلیم عاجزؔ نے اس پورے سفرنامے میں اقبالؔ کے بہتیرے اشعار نقل کئے ہیں اور اکثر جگہ ان کے اشعار کو نثری انداز میں بھی پیش کیا ہے۔ یہ کلیم عاجزؔ کی وہ کتاب ہے، جس میں اقبالؔ اس طرح چھائے نظر آتے ہیں کہ اگر کوئی کلیم عاجزؔ کی صرف اس کتاب کا مطالعہ کرے تو انہیں پکا اقبالؔ پرست سمجھ بیٹھے گا۔ طواف کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک ایسے عالم میں پہنچتے ہیں، جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب زمین و آسمان

کا فاصلہ ایک جست سے زیادہ نہیں ہے''۔

(صفحہ: ۵۹)

اقبالؔ کہتے ہیں کہ:

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

چینی اردو داں حاجیوں سے مل کر کلیم عاجزؔ بہت خوش ہوتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں:

''واہ رے اردو اور شاباش رے اردو، آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا''۔

(صفحہ: ۸۶)

ع آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

(اقبالؔ)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جس فرد یا جس قوم میں محاسبہ زندہ ہوتا ہے، اس فرد یا اس قوم کی مثال شمشیر دو پیکر کی ہے''۔

(صفحہ: ۸۹)

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

(اقبالؔ)

مقامِ بدر کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس وقت کہیں کہیں اہل کارواں کی بجھائی ہوئی راکھ اور کہیں کہیں ٹوٹی ہوئی طناب نظر آ گئی تھی''۔

(صفحہ: ۱۱۲)

ع آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

(اقبالؔ)

بیت اللہ کی زیارت پر پیدا ہونے والی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بس دو ہی رنگ نظر آتا ہے: سیاہ و سفید۔ اس سیاہ و سفید رنگ سے ہر رنگ

پیدا ہوتا ہے۔ یہ سلسلۂ روز و شب، یہ تارِ حریرِ دو رنگ، یہی نقش گرِ حادثات ہیں۔ انہیں سے ذات اپنی تمام قبائے صفات بناتی ہے''۔

(صفحہ: ۱۹۱)

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

(اقبال: ''مسجد قرطبہ'')

غرض پورے سفرنامے کی تصنیف کے وقت اقبالؔ، کلیم عاجزؔ کے حواس پر چھائے رہتے ہیں اور ہم سفرنامے ساتھ ساتھ اقبالؔ کے اشعار کا بھی لطف اٹھاتے جاتے ہیں۔

اس سفرنامے میں کلیم عاجزؔ کی زبان بھی خاصی توجہ کی چیز ہے۔ اس میں انہوں نے بول چال کے الفاظ کا بہ کثرت استعمال کیا ہے، جس سے زبان زیادہ مانوس اور پرتاثیر ہوگئی ہے اور مطالعے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس سفرنامے میں نہ صرف یہ کہ کلیم عاجزؔ نے بول چال کے الفاظ استعمال کئے ہیں؛ بلکہ متعدد جگہ ٹھیٹھ بہاری لب ولہجہ اور زبان اختیار کی ہے اور اس میں ایسی بے ساختگی اور موزونیت ہے کہ زبان کی دلچسپی اور مانوسیت دوبالا ہوجاتی ہے۔ مثلاً:

''اس گھٹا ہے کا چہرہ بگاڑ دو''۔

(صفحہ: ۱۳)

''وہ آگے میں پیچھے..... بہرحال میں پٹھیا ٹھوک ہی رہا''۔

(صفحہ: ۹۱)

'جو جَے کھے ہونا تھا چپلوں پر ہوا'

(صفحہ: ۹۳)

''جگہ تنگ تھی سامان سے اور سامان والوں سے ویگن کسم کس تھی''۔

(صفحہ: ۱۰۸)

''معلم کا خیمہ جلا، معلم کی فاضل آمدنی تھی، اسے جلا کر اللہ نے سود مور برابر کردیا''۔

(صفحہ: ۹۹)

''مہدی مرحوم و مغفور سٹک سیتارام ہوکر کار کی کھڑکی سے چمٹ کر سرنگوں ہوگئے''۔

(صفحہ: ۱۲۷)

''میں کھا نہیں رہا تھا؛ بلکہ چونگ رہا تھا''۔

(صفحہ: ۱۷۲)

''بالاخانوں پر عاشقوں، دیوانوں، آشفتہ سروں کا ہجوم ٹھسم ٹھس تھا''۔

(صفحہ: ۱۸۵)

''میں جب پہلی بار بارہ سال پہلے گیا تھا تو کپڑے کی کھڑے گھاٹ کی دھلائی ایک ریال میں دو تھی''۔

(صفحہ: ۱۹۳)

''اور مشاعرہ سن کر بھورے روانہ ہوجاتے تھے''۔

(صفحہ: ۲۲۰)

خلاصہ یہ ہے کہ کلیم عاجزؔ کا یہ سفرنامہ حج کی پوری تفصیل کے ساتھ حجاز مقدس اور عربوں کے کردار کا بڑا خوبصورت اور واضح نقشہ پیش کرتا ہے۔ ہم اس کے مطالعے سے وہاں کی سڑکوں، گلیوں، دکانوں، دکانداروں، عربی حضرات کے اخلاق، وہاں کے رہن سہن سے بھی واقف ہوجاتے ہیں اور یہ سارا بیان بے حد دلکش ہے۔ یہ ساری تصویر نہایت حسین وجمیل اور صاف ہے۔ عالمِ سوز وساز میں قلب روشن کے ساتھ لکھی گئی، اس کتاب کا مطالعہ حج کے پورے ماحول اور عربی زندگی کو ہمارے سامنے مجسم کردیتا ہے اور دل سعادتِ حج کے لیے تڑپ اُٹھتا ہے؛ مگر ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس میں کتابت کی بہت ساری غلطیاں راہ پاگئی ہیں اور چند ایک مصنف کے سہوِ قلم کا نتیجہ بھی معلوم ہوتی ہیں۔

۳۔ 'اک دیس اک بدیسی'

'اک دیس اک بدیسی' کلیم عاجزؔ کا 'سفرنامۂ امریکہ' ہے۔ اس میں انہوں نے امریکہ اور کناڈا کے سفر کے اہم واقعات، معمولات اور محسوسات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ وہاں کی معاشرت اور تہذیب ہمارے سامنے زندہ ہوجاتی ہے اور اس ترقی یافتہ ملک کا ظاہر وباطن ہمارے سامنے بے نقاب ہوجاتا ہے۔

کلیم عاجزؔ اپنے سفرنامۂ امریکہ کا مقصد بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''سیاحت کے دو بنیادی موضوع ہیں: ایک تو چیزوں کو دیکھنا، طبیعت کو فرحت

اور بشاشت فراہم کرنا۔ دوسرا ان کی حقیقت تک پہنچنا اور ان سے نتائج اخذ کرنا''۔

(صفحہ: ۲)

یعنی کلیم عاجزؔ سیاحت کے دو مقاصد مانتے ہیں: ایک سیاحت برائے سیاحت؛ یعنی برائے سیر و تفریح اور دوسرا سیاحت برائے بصیرت۔ آگے اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''میں نے ہندوستان سے امریکہ کا سفر نہ سیاحت کے لیے کیا ہے، نہ ملازمت کے لیے، نہ تجارت کے لیے، میں نے یہ سفر محبت کے لیے کیا ہے، مجھے یہ کمائی عزیز ہے''۔

(صفحہ: ۹)

کلیم عاجزؔ چوں کہ ریاست بہار کے تبلیغی جماعت کے امیر بھی ہیں؛ اس لیے اس سفر کو تبلیغی دورہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس سفرنامے میں انہوں نے دو چیزیں خاص طور سے اُجاگر کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغرب میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ بڑی امید افزا ہے اور لوگوں میں اسلام سے محبت بڑھ رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اب مغرب کا خوبصورت نقاب اُتر رہا ہے اور اس کا مکروہ چہرہ آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے۔ یہی دراصل ان کا بنیادی مقصد سفر بھی ہے، لہٰذا انہوں نے ایک جگہ خود ہی فرمایا ہے کہ:

''کولمبس نے امریکہ دریافت کیا، میں کولمبس کے دریافت کئے ہوئے امریکہ میں بسنے والے انسانوں کو دریافت کرنا چاہتا ہوں''۔

(صفحہ: ۲۵)

اپنے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کلیم عاجزؔ نے امریکہ اور امریکیوں کی زندگی کا مطالعہ قلب روشن، دیدۂ بینا اور نگاہِ بصیرت سے کیا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

''منافقوں کے یہاں اندر اصل ہوتا ہے اور باہر نقل.... اسی متضاد کیفیت میں یورپ اور امریکہ کی زندگی ڈوبی ہوئی ہے۔ مکان ایسے حسین، سجاوٹیں ایسی دل آویز، لباس ایسے دلکش، چہرے ایسے دلنشیں، ادائیں ایسی دلنواز، کھانے ایسے دل پسند، کاریں ایسی دل رُبا، باتیں ایسی دلچسپ، سڑکوں، سبزہ زاروں، دکانوں، ہوٹلوں، آفسوں اور روشنیوں کا یہ عالم کہ بے اختیار لال قلعہ کی دیواروں پر لکھا ہوا یہ شعر یاد آجائے کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است ہمیں است ہمیں است

لیکن زندگیاں اندر بے چین، بے اطمینان، بے سکون اور غیر آسودہ، مضمحل،

اُداس، جنہیں پوشیدہ رکھنے کے لیے کھیلوں، تماشوں، شراب خواریوں اور عیاشیوں کی بھٹیوں میں بے تحاشہ انسان کودتے ہیں۔ دل محبتوں سے خالی، رشتے گرم جوشیوں سے محروم، تعلقات اور ملاقات اخلاص سے مبرّا.... ابھی انسان ہیں ابھی جانور، ابھی ہوش میں ہیں ابھی دیوانے، ابھی ہم بغل ہیں ابھی خنجر بکف، ابھی اپنے ہیں ابھی پرائے۔ نہ لحاظ عہد و پیماں ہے نہ پاس وضع ایماں ہے، نہ رشتہ معتبر ہے نہ ناتہ قابلِ اعتماد ہے''۔

(صفحہ: ۲)

یہ ہے امریکہ کا ظاہر و باطن۔ یہ ہے مغرب کا حقیقی اور اصلی روپ۔

دوسری چیز جو اس سفرنامے میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ یہ کہ مغرب کا اصلی چہرہ جیسے جیسے نمایاں ہوتا جارہا ہے، لوگ دینِ اسلام کی طرف رجوع ہو رہے ہیں۔ اس میں وہ بھی ہیں، جو خاندانی مسلمان ہیں اور وہ بھی ہیں، جو اپنی تہذیب سے متنفر ہو کر روحانی سکون کی تلاش میں اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال مغرب میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے راہیں ہموار کر رہی ہے۔ خاندانی مسلمانوں کے بارے میں اس انداز میں تبصرہ کرتے ہیں:

''یوروپ اور امریکہ میں بسنے والے مسلمان وہ ہیں جو دس پندرہ برس پہلے مال کمانے آئے تھے۔ مال کھاتے کھاتے ایمان کمانے لگے۔ لاکھوں روپئے کا مکان، لاکھوں کے سامان میں رہ کر اب یہ سوچنے لگے ہیں کہ جس نے مال دیا ہے، سامان دیا ہے، وہ کیا ہم سے کچھ چاہتا بھی ہے؟ اور یہ جان کر کہ اس کے بڑے تقاضے اور بڑے مطالبے ہیں، ان تقاضوں اور مطالبوں کے ادا کرنے کے لیے اب فکرمند ہیں۔ شکاگو میں دیکھا، ٹورنٹو میں دیکھا، ونڈسر اور ڈیٹورائٹ میں دیکھا کہ ہندستان، پاکستان میں اپنے ہاتھوں سے اسلام کو ذبح کرنے والے اب اسلام کے لیے اپنے کو ذبح کر رہے ہیں۔ شکاگو میں جو گھر دیکھا، جس مجلس میں گئے، اوقات کی پابندی کے ساتھ نماز کا اہتمام دیکھا''۔

(صفحہ: ۴۱، ۴۲)

تو یہ ہے خاندانی مسلمانوں کا حال جو دین کی پناہ میں لوٹ رہے ہیں اور کلیم عاجزؔ کا یہ سفر چوں کہ جیسا کہ میں نے قبل عرض کیا ہے کہ تبلیغی نوعیت کا تھا؛ اس لیے وہ خود لکھتے ہیں کہ:

''میرے آنے کا مقصد اور منشا اسی 'نمی' کا رواج ذرا تیز اور استوار کر دینا ہے''۔

(صفحہ: ۴۳)

نومسلموں کے اسلام کی طرف جھکاؤ اور ان کی راسخ العقیدگی اور پابندیٔ شریعت کا حال بیان کرتے ہوئے کلیم عاجزؔ حیرت زدہ ہوکر کہتے ہیں کہ:

''میں اس نومسلم عیسائی کو دیکھتا تھا جس کا اسلام چار سال پرانا تھا اور ان عربوں کو دیکھتا تھا، جن کا اسلام صدیوں پرانا تھا، جو صحابہ کی اولاد ہوں گے اور صحابہ کی سرزمین کے باشندے تھے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانہ سے

(صفحہ: ۷۴،۷۵)

اس سفرنامے میں کلیم عاجزؔ نے امریکہ کی سرزمین پر اردو شعروشاعری کی محفلوں کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ کیا۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کی محفل شعروسخن میں بیٹھنے والا سامع خود کو ہندوپاک کی مجلس ہی میں تصور کرتا ہے۔ کلیم عاجزؔ نے کتاب کے آخر میں کچھ شعرا کے نام اور ان کے کلام بھی درج کئے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شعروشاعری کی شمع وہاں آب وتاب کے ساتھ روشن ہے۔

کلیم عاجزؔ کا یہ سفرنامہ، امریکہ کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے اور یہ امریکہ سے متعلق ایک دلچسپ سفرنامہ ہے، جس کے مطالعے سے مسرت اور بصیرت کا احساس ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ کلیم عاجزؔ کا یہ سفر تبلیغی نوعیت کا تھا، لہٰذا اس میں جگہ جگہ ناصحانہ اور مبلغانہ رنگ بھی نمایاں ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ 'سفرنامۂ حج' کی طرح اس سفرنامے میں بھی اقبالؔ جگہ بہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کلیم عاجزؔ کو سفر کے دوران علامہ اقبالؔ بہت یاد آتے ہیں۔

۴۔ 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی....'

'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی....' کلیم عاجزؔ کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ اس میں کلیم عاجزؔ نے اپنے حالاتِ زندگی، خاص طور سے تیلہاڑا کی زندگی بڑے حسن اور سلیقے سے بیان کئے ہیں۔ اس میں اثریت، بے ساختگی اور دلکشی اتنی بلندی پر ہے کہ ان کا بیان مشکل ہے۔ یہ تصنیف دراصل کلیم عاجزؔ کے پہلے شعری مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے دیباچہ کی ایک علاحدہ اور تفصیلی پیش کش ہے۔ اس تصنیف کے بارے میں خود کلیم عاجزؔ کا کہنا ہے کہ:

''وہ جو شاعری کا سبب ہوا' شائع ہوا تو بیشتر حلقوں سے مجھ پر یہ تقاضے ہوئے کہ اس کے نثری دیباچے کو علاحدہ شائع کرو۔ دیباچہ بہت جلدی میں لکھا گیا تھا۔ خود

مجھے سیری نہیں تھی۔ خود مجھے اس کی خلش محسوس ہو رہی ہے کہ مجھے کھل کر سامنے آنا ہے۔ اس واقعۂ حسین اور سنگین کو میں جس قدر مصلحت اجازت دے سکے، کچھ زیادہ وضاحت سے سامنے لانا ہے، چناں چہ دوبارہ قلم اُٹھایا''۔

(''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی.....''، صفحہ: ۱۴۳)

حقیقت یہ ہے کہ کلیم عاجزؔ نے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا....' کے دیباچے میں ان باتوں کو جس جامع اختصار سے نہایت حسن اور اثریت کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ اس تصنیف میں تفصیل کے سبب ختم نہیں ہوا؛ لیکن کچھ کم ضرور ہوگیا ہے، جس طرح ایک چھوٹی تصویر کو بڑا ('اِن لارج') کرنے سے اس میں کچھ دھیما پن آجاتا ہے، کچھ یہی صورت حال اس تصنیف کی بھی ہے، جو شخص 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا.....' کے دیباچے کو پڑھ چکا ہو، اسے اس میں جذبات کی شدت اور احساسات کی حدّت میں کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے، اگر کلیم عاجزؔ دوسری تصنیف کی بجائے اس دیباچے کو علاحدہ سے شائع کروادیتے تو زیادہ بہتر ہوتا؛ کیوں کہ ہزار ہا باذوق اور باشعور افراد اس نثری حصے کے مطالعے کے بعد یہ تاثر رکھتے ہیں کہ کلیم عاجزؔ جس بلند پایہ کے شاعر ہیں، ان کی نثر نگاری بھی ان کی شاعری سے کسی درجہ کم نہیں ہے۔ بعض حضرات تو اس پر بھی بس نہیں کرتے؛ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کی نثر نگاری کا پایہ شاعری سے بلند ہے اور دَورِ حاضر میں اس میدان میں ان کا کوئی مدّ مقابل نہیں ہے۔

'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں کلیم عاجزؔ نے اپنی یادوں کی خوشبوؤں کو اس حسن اور سلیقے سے پیش کیا ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے جہاں سے آپ کھولیے، وہیں سے پڑھنا شروع کردیجئے، آپ بھرپور لطف اور حظ محسوس کریں گے۔ جذبات کی لَے پر لکھی گئی بے ساختہ، اثرانگیز اور خوشبودار نثر آپ کو اپنے اندر بھرپور طریقے سے جذب کرلے گی۔ یہ کتاب نہ کوئی ناول ہے، نہ افسانہ، نہ کہانی؛ بلکہ آپ بیتی ہے؛ لیکن داستانوں سے زیادہ دلچسپ اور افسانوں سے زیادہ اثرانگیز ہے۔ اس میں واقعات اور افراد کی ایسی زندہ و پُرکشش لفظی مرقع کشی ملتی ہے کہ قاری ایسا محسوس کرتا ہے، جیسے وہ واقعہ اس کے سامنے زندہ ہوگیا ہے اور اس کے کردار اس کے سامنے مجسم ہیں۔ مصنف کا کمال ہے کہ وہ جذبات واحساسات کو مکمل لفظی شکل دینے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ نثر میں جو بے ساختگی، کیفیت، لذت، حلاوت اور اثریت ہے وہ ایک عظیم الشان کامیابی سے تعبیر کئے جانے کے لائق ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کلیم عاجزؔ نے اپنی دوسری تصنیف 'اک دیس ایک بدیسی' میں لکھا ہے کہ:

''وہ تو یادوں کے سمندر سے نکالے ہوئے چلّو ہیں''۔

(''اک دیس اک بدیسی''، صفحہ: ب)

میرا خیال ہے کہ اس کتاب میں 'یادوں کے سمندر سے نکالے گئے چلو' نہیں؛ بلکہ یادوں کے سمندر سے نکالے گئے موتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات جو بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں، اس کے پس پردہ کلیم عاجز نے بڑی قیمتی اور اعلیٰ باتیں کہی ہیں: ''اس کتاب میں دراصل انسانی قدروں کی بازیافت کی گئی ہے''۔

اس کتاب کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں انسانی سماج میں بسنے والے ان افراد کی کردار نگاری کی گئی ہے، جنہیں ہم عام طور سے ناقابل اعتنا، یا لائق نفرت سمجھتے ہیں، مثلاً اخبار فروش، قلی، نان بائی اور طوائف وغیرہ۔ کلیم عاجز نے اپنی اس تصنیف میں ان افراد کو اس فنکاری سے پیش کیا ہے اور ان کی کردار نگاری کچھ اس زاویے سے کی ہے کہ وہ انسانیت کی معراج نظر آنے لگتے ہیں اور ہماری نظروں میں ان کا قد بے حد بلند ہو جاتا ہے، یہ چیز اردو ادب میں تقریباً نایاب ہے۔

کلیم عاجز نے اپنی اس تصنیف میں طوائف، غنڈوں، اخبار فروش، تھیٹر کے گیٹ کیپر، قلی، نان بائی کے کردار کو اتنا بلند پیش کیا ہے کہ ہمیں حیرت ہونے لگتی ہے کہ ہمارے سماج میں رہنے والے یہ ناقابل اعتنا افراد اتنی عظیم قدروں کے حامل ہو سکتے ہیں؟ ان کو پڑھ کر بے اختیار ان کی عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کلیم عاجز کی فنکاری کا کمال ہے۔ کلیم عاجز نے ان حسین مرقع کشی اور پرتاثیر کردار نگاری کے ذریعہ ختم ہوتی ہوئی انسانی قدروں کی بازیافت کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے مطالعے سے خودغرضی اور مطلب پرستی کے اس دَور میں قاری کو بہ شدّت احساس ہوتا ہے کہ وہ عظیم انسانی قدروں کو جسے اس مادہ پرستی کے دَور نے کمزور، یا زائل کر دیا ہے، پھر سے اپنے اندر بھرپور انداز میں اُجاگر کرے؛ کیوں کہ اسی میں زندگی کی بھرپور لذت اور کامیابی پوشیدہ ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلیم عاجز نے اپنی اس تصنیف کے ذریعہ اردو ادب کو ایک نئے ذائقے اور نئی خوشبو آمیز نثر سے آشنا کیا ہے جس میں بے تکلف، بے ساختہ، رواں اور اثر انگیز زبان میں واقعات اور شخصیات کی ایسی نادر مرقع کشی کی گئی ہے کہ تصور، تصویر بن جاتی ہے۔ واقعات اور افراد نظروں کے سامنے مجسم ہو جاتے ہیں۔ کلیم عاجز کی نثر کا بڑا کمال یہ بھی ہے کہ وہ جن جذبات وکیفیات کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں، اسے الفاظ کا کامیاب روپ عطا کر کے قاری کے اندر بھی انہیں جذبات وکیفیات کو پیدا کر دیتے ہیں۔

۵۔ 'ابھی سن لو مجھ سے'

'ابھی سن لو مجھ سے' کلیم عاجز کی خودنوشت کا دوسرا طویل حصہ ہے، اس میں کلیم عاجز نے اپنی آپ بیتی دو سو بیالیس صفحات میں بیان کی ہے۔ کلیم عاجز کی یہ آپ بیتی سب سے پہلے پٹنہ کے

اردو روزنامہ 'قومی آواز' میں کئی مہینوں تک قسط وار چھپتی رہی، جسے قارئین نے بہت پسند کیا؛ اسی لیے کلیم عاجز نے بعد میں اس کی تدوین کر کے کتابی شکل میں شائع کیا۔

اس سوانح عمری میں کلیم عاجز نے اپنی زندگی کے احوال اور اپنے کچھ معاصرین ادب اور معاصرین معاشرہ کے حالات بیان کئے ہیں۔ نیز مختلف تحریکات اور ادبی رجحانات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ حسب دستور اس سوانح عمری میں بھی انہوں نے اپنے آبائی گاؤں تیلہاڑا کے خونی اور المناک واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کتاب میں ان واقعات کے پہلو بہ پہلوان کے دوست، احباب، رشتے دار اور گاؤں والوں کا ذکر بھی بہت خوبصورت اور دل نشیں انداز میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس وقت کی زندگی اور اس وقت کی معاشرت صاف اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کلیم عاجز ان باتوں کے بیان میں اس بات پر خصوصی زور دیتے ہیں کہ انسان اور انسانی قدروں کا زوال ہوا ہے اور وہ ان قدروں کی بازیافت کے لیے بے چین اور مضطرب نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریر کو پڑھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی خوبصورت قدروں، آپسی بھائی چارگی، بے لوث میل ومحبت اور انسان دوستی جیسی اعلیٰ خصوصیت کا احیا چاہتے ہیں۔

'ابھی سن لو مجھ سے' کلیم عاجز کی ایک ایسی تصنیف ہے، جس میں خلوص، صداقت اور محبت کی کارفرمائی نظر آتی ہے، وہ مشرقی اقدار، مذہبی رواداری اور انسانی قدروں کی علمبردار ہے۔

۶۔ 'دفتر گم گشتہ'

'دفتر گم گشتہ' کلیم عاجز کی پی ایچ-ڈی کی تھیسس ہے، اس کا اصل نام ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا'' ہے۔ بقول کلیم عاجز:

> ''یہ مقالہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک بہار کے اردو شعرا کا پہلا انتخابی مجموعہ ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کی بہار کی اردو شاعری کا پہلا تفصیلی جائزہ ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے شعرا پر دبستانی خصوصیات کے تاریخی پس منظر میں تنقید کی پہلی کتاب ہے''۔

(دیباچہ، 'دفتر گم گشتہ'، صفحہ۔3)

کلیم عاجز نے پہلے باب میں ثقافت، زبان وادب پر اپنے خیالات اور نظریات کو تفصیل

سے پیش کیا ہے، ساتھ ہی تاریخی، اخلاقی، مذہبی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی پس منظر میں شعرواب کا جائزہ لے کرانہوں نے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

'دفتر گم گشتہ' میں کلیم عاجز نے دوسرے باب میں فرحت عظیم آبادی، شاہ امیرالدین وجد بہاری، نواب جعفرحسن خان فیض آبادی، علامہ محمد سعید حسرت عظیم آبادی، علامہ عبدالحمید پریشاں عظیم آبادی، حشر بیتھوی گیاوی، صفیر بلگرامی، بدر آروی، صوفی منیری، کیفی بہاری، اکبر داناپوری، کامل دھرم پوری، باقر عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، سلطان عظیم آبادی، علامہ آزاد عظیم آبادی، نواب امداد اثر امام، سید ظفر شاہ قمر، پروفیسر شہباز عظیم آبادی، احقر بہاری، عشرت گیاوی، علامہ شوق نیموی، مشرقی منیری، رنجور عظیم آبادی، مبارک عظیم آبادی، بسمل دربھنگوی، ضیا عظیم آبادی، جیسے کل 47 شعرا کا بڑا تحقیقی اور معیاری جائزہ لیا ہے، جس سے اس کتاب کی تحقیقی حیثیت مُسلّم ہو جاتی ہے۔

الغرض تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

۷۔ 'دیوانے دو'

بڑی تقطیع میں 326 صفحات پر مشتمل کتاب 'دیوانے دو' کلیم عاجز کے اردو اور انگریزی کے ساٹھ خطوط کا مجموعہ ہے، یہ خطوط انہوں نے ڈاکٹر جگن ناتھ کوشل کے نام لکھے ہیں، جگن ناتھ کوشل بہار کے سابق گورنر اور مرکزی حکومت میں وزیر قانون تھے۔ اس مجموعہ میں اردو زبان میں 57 اور انگریزی زبان میں 13 خطوط شامل ہیں۔ کلیم عاجز نے اردو میں خطوط لکھے ہیں اور جگن ناتھ کوشل نے ان کے جوابات انگریزی میں لکھے ہیں۔ اس کتاب میں جگن ناتھ کوشل کے خطوط ان کی اپنی تحریر میں شائع کئے گئے ہیں۔

ان خطوط کے مطالعہ سے جہاں کلیم عاجز اور سابق گورنر بہار جگن ناتھ کوشل کے باہمی تعلقات اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سماج اور معاشرہ میں اخلاقی انحطاط سے مضطرب اور فکرمند ہیں اور یہاں بھی انسانی اور اخلاقی قدروں کی سربلندی اور احیا کی تڑپ ہے۔ اگرچہ یہ خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں؛ مگر ان کے مطالعہ سے اس دور کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے، سماجی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ان دونوں کی اعلیٰ اقداری باتوں کے مطالعہ سے ایک روشنی اور بہتری کی جھلک ملتی ہے۔

۸۔ 'پہلو نہ دُکھے گا'

کلیم عاجز کی کتاب 'پہلو نہ دُکھے گا' ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے، جو انہوں نے اپنی بھانجی ریحانہ کے نام لکھے ہیں، اس میں کل 69 خطوط شامل ہیں۔

کلیم عاجز کو خطوط نگاری سے ایک خاص شغف ہے اور اس میں انھیں ملکہ حاصل ہے، اگرچہ انہوں نے یہ خطوط اپنی بھانجی (جو امریکہ میں مقیم ہیں) کے نام لکھے ہیں اور ذاتی نوعیت کے خطوط ہیں؛ لیکن ان کے مطالعہ میں بھی کلیم عاجز کی فکر و نظر کی جھلکیاں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ وہ ملک کے حالات، دنیا کے حالات، سماجی اور سیاسی زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں سے بے حد پریشان و متفکر ہیں، وہ دنیا میں اخلاقی اور انسانی قدروں کی بازیافت چاہتے ہیں اور اس طرح خطوط ذاتی نہ رہ کر عمومی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

۹۔ 'میری زبان میرا قلم' (حصہ اوّل اور دوم)

کلیم عاجز کی یہ تصنیف 'میری زبان میرا قلم' دیگر تصانیف سے جداگانہ نوعیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اس کتاب میں کلیم عاجز کی نثری تحریریں ہیں، جو مضامین اور مقالوں کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سے اکثر تحریر مختلف اہم شخصیتوں مثلاً: عبدالقیوم انصاری، مبارک عظیم آبادی، اختر اورینوی، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد عبدالحئی، مولانا انعام الحسن، افتخار فریدی، علامہ فضل حق آزاد، ولی کاکوی، راسخ عظیم آبادی، عرفان اعظمی، عبدالمغنی جیسے اصحاب علم و ادب پر مشتمل ہے۔

کلیم عاجز کے مذکورہ مضامین و مقالے ان کی ذاتی فکر و نظر کے غماز ہیں، ان کو پڑھنے سے ایک نئی تصویر اور ایک نیا زاویۂ نظر سامنے آتا ہے، مذکورہ شخصیتوں کے علاوہ مختلف موضوعات، مختلف حالات اور مختلف واقعات کو بھی کلیم عاجز نے اپنا موضوعِ گفتگو بنایا ہے، مثلاً: الیکشن ڈیوٹی، پٹنہ سے لاہور تک کا سفر، حج کے متعلق تاثرات، شاعری اور مشاعرہ، غزل اور اس کی تنقید، نقد و تبصرہ، بہار کی اردو شاعری، میں اور میری شاعری وغیرہ عنوان سے انہوں نے درجنوں قیمتی اور معلوماتی مضامین لکھے ہیں۔ اس کتاب کے دونوں حصوں کو خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ نے 2005ء میں شائع کیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ جہاں ایک طرف ہمیں علم و ادب اور آگہی سے آشنا کرتا ہے، وہیں اس کے اندر اعلیٰ انسانی اور تہذیبی قدروں کا ذکر ہمیں فکر و عمل کی دعوت بھی دیتا ہے۔

کلیم عاجز کا نثری اسلوب

کلیم عاجز کو اردو دنیا عام طور سے ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے اور انہیں ایک بڑا شاعر تسلیم کرتی ہے؛ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، جو انہیں ایک صاحبِ طرز نثر نگار کی حیثیت سے بھی جانتے اور مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیم عاجز جس طرح ایک عالی مرتبت اور منفرد لب و لہجہ کے غزل گو شاعر ہیں، اسی طرح ایک اعلیٰ پائے کے صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی غزلوں کے پہلے مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا......' کا سو صفحات پر مشتمل مقدمہ 'ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ' ان کی نثر نگاری کا شاہکار ہے، یہی مقدمہ ہے، جس نے کلیم عاجز کو اردو ادب میں ایک صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مشہور کر دیا؛ بلکہ ان کی نثر نگاری کا لوہا بھی منوا لیا، لہٰذا اب صورت حال یہ ہے کہ بہتیرے باذوق اور باشعور حضرات انہیں 'شاعر' سے زیادہ 'نثر نگار' منوانے پر مصر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کلیم عاجز اگر ایک بڑے شاعر ہیں تو ایک بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔

بلاشبہ کلیم عاجز کی نثر نگاری میں جو سحر طرازی، ماحول آفرینی، جذبات انگیزی، بے ساختگی اور الفاظ کی موجزنی ملتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی نثر نگاری کے اس البیلے پن نے اردو نثر کو ایک نئی کیفیت، ایک نئے ذائقے اور ایک نئی خوشبو سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کی نثر میں جیسی دلسوزی، جیسی جاں گدازی، جیسی دل گرفتگی، جیسا حسن، جیسی بے تکلفی، جیسی مرقع کشی، جیسی جذبات نگاری اور جیسی بے ساختگی موجود ہے، وہ اردو نثر نگاری میں خال خال ہے۔

صاحب طرز نثر نگار ہونا نہ تو معمولی بات ہے اور نہ ہی عام؛ بلکہ صاحب طرز اور صاحب اسلوب ہونا بڑی توفیق کی بات ہے، اس کے لیے صحت مند انفرادیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جوہر انفرادیت سینکڑوں ادیبوں میں سے کسی ایک ہی کے قلم میں چمکتا ہے۔ کلیم عاجز کا صاحب طرز ہونا ان کی انفرادیت اور برتری کی دلیل ہے۔

ذیل میں ہم کلیم عاجز کی نثر نگاری کی اہم خصوصیات کو نکات وار پیش کر رہے ہیں:

بے ساختگی اور بے تکلفی

ایک اچھی نثر صاف و شفاف شیشے کی طرح ہوتی ہے، جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے؛ یعنی ایک بہترین نثر میں نثر نگار کی بات صاف صاف اور سیدھی سادی ہوتی ہے، اس میں ژولیدگی یا پیچ و خم نہیں ہوتا۔ کلیم عاجز کی نثر میں بیان کی صفائی اور اظہار مافی الضمیر کی کامیاب ترسیل تو ہے ہی، اس کے ساتھ ہی اس میں بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی بے تکلف انسان بول چال کی زبان میں بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے؛ اس لیے قاری کو اس میں بڑی اپنائیت اور دل گرفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا کلیم عاجز جس انداز سے سوچتے ہوتے ہیں، اسی انداز سے لکھتے بھی ہیں۔ اس میں تکلف یا بناوٹ کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ ان کی بات دل کی گہرائی سے نکلتی ہے اور دل کی گہرائی میں جا بیٹھتی ہے۔

کلیم عاجز کی نثر کی بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جس انداز سے سوچا، من وعن اسی انداز سے تحریر کر دیا، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''انسان کا دماغ میجک لالٹین ہے، کبھی اس میں کشمیر کی شہزادی پھولوں پر سوئی نظر آتی ہے، کبھی ٹیپو سلطان کے معرکے نظر آنے لگتے ہیں، کبھی بھائی جان، کبھی پنڈت ترپاٹھی کی کن اینٹھیاں۔۔۔شاید نہیں کہا ہے''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۳۵)

قاری کشمیر کی شہزادیوں کو سمجھ رہا ہے، ٹیپو سلطان سے واقف ہے۔ کلیم عاجز اپنے بھائی جان کا ذکر کر چکے ہیں؛ لیکن جب وہ پنڈت ترپاٹھی کا نام لیتے ہیں تو انہیں یاد آتا ہے کہ ان کے متعلق انہوں نے قاری کو کچھ بتایا ہی نہیں؛ اس لیے وہ خود کلامی کرتے ہیں کہ پنڈت ترپاٹھی کے بارے میں 'شاید نہیں کہا ہے' اور انہوں نے بے ساختہ اسی انداز میں تحریر بھی کر دیا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

> ''میرے لیے کوئی کچھ بن نہیں پا رہا ہے اور میرے لئے کوئی کر نہیں سک پا رہا ہے''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۳۰۱)

''کوئی کرنہیں سک پا رہا ہے''، میں جو بے ساختگی ہے وہ محسوس کرنے کی بات ہے، ان کی بے تکلفی اور بے ساختگی اس حد تک ہے کہ بقول کلیم عاجزؔ: ''جب وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کا ذہن بالکل خالی ہوتا ہے۔ کاغذ پر قلم رکھنے سے جو لفظ لکھا یا بنا، اس سے لفظوں کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے''۔ ایسا لگتا ہے کہ خیالات اور الفاظ دست بستہ چلے آ رہے ہیں۔ ٹھیک اسی انداز سے جیسے پانی فراز سے نشیب کی طرف بڑی سبک گامی کے ساتھ بہتا جاتا ہے۔ اسی بے ساختگی اور اسی بے تکان بیانی کے سبب کبھی کبھی واقعات کی تکرار بھی ہو جاتی ہے، یا کبھی کبھی کوئی نامانوس سا لفظ نثر میں کھٹکنے لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کلیم عاجزؔ لفظ کی جستجو میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رُکتے، وہ جس رفتار سے سوچتے ہیں، اسی رفتار سے لکھتے جاتے ہیں۔ تکرار واقعہ کی مثال ملاحظہ ہو:

''میری عمر کم و بیش آٹھ سال ہوگئی۔ منظور مرحوم مجھ سے دو سال بڑے تھے اور فاطمہ مجھ سے ڈیڑھ سال چھوٹی تھی''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۴۵)

دوسرے ہی صفحہ پر پھر تحریر کرتے ہیں:

''منظور مرحوم مجھ سے دو سال بڑے تھے اور فاطمہ ڈیڑھ سال چھوٹی تھی''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۴۶)

کلیم عاجزؔ کی تحریر کی تیز گامی کے سبب کبھی کبھی ان کی نثر میں کچھ الفاظ کھٹکنے لگتے ہیں، مثلاً:

''آنگن میں کیلا کا مجسم درخت لا کر گاڑ دیا گیا''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۳۸۱)

'کیلا کا مجسم درخت' کی بجائے 'مسلّم درخت' مناسب اور موزوں ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''جس مکان میں ہم لوگ مقیم تھے، اس میں ایک سیدھی لکیر میں تین چار کمرے تھے''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۴۰)

'سیدھی لکیر میں تین چار کمرے تھے'، کی بجائے اگر یہ ہوتا کہ 'ایک سیدھ میں یا ایک قطار میں تین چار کمرے تھے'، تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بیت اللہ شریف کے صحن میں انسانوں کی ایک چلّی تھی جس نے تمام صحن کو اپنی دسترس میں لے لیا تھا''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۳)

یہاں 'صحن کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا'، زیادہ مناسب ہوتا۔

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اعظم نانا کی تحریردار پاپلین کی قمیض''۔

'تحریردار' کی بجائے 'دھاری دار پاپلین کی قمیض' زیادہ مناسب ہے۔

کلیم عاجزؔ سے اس بے ساختگی کے سبب کبھی کبھی نئے نئے الفاظ بھی وضع ہو جاتے ہیں، جو بے ساختہ ہونے کے سبب بڑے خوبصورت اور چست معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

''ان کے مطالعہ میں ہر وقت نثری اور نظمی تخلیقات رہتیں''۔

(مقدمہ: جب فصل بہاراں آئی تھی-۳۱)

'نثری اور شعری' جیسی عام اور مروّج ترکیب کی بجائے 'نثری اور نظمی' کی ترکیب بڑی بے ساختہ اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مذہبیات میں دلچسپی ہوتی اور تاریخیات میں کشش''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۲۲۳)

'مذہبیات' کے مقابل 'تاریخیات' کی اصطلاح بھی بے ساختہ اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔

سفرنامۂ امریکہ 'ایک دیس اک بدیسی' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جس کے حسن، جس کی صفائی اور جس کی شانداری کی باتیں''۔

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۲۰)

اس میں لفظ 'شانداری' بڑا بے ساختہ اور حسین معلوم ہوتا ہے۔

غرض کلیم عاجزؔ کی نثر میں بے ساختگی اور بے تکلفی ایک اہم اور نمایاں وصف ہے اور ان کے اسلوب کا ایک خاص جز ہے۔ یہ بے ساختگی اور بے تکلفی ان کی نثر میں یکساں اور عام ہے۔

خاص لفظوں کا استعمال

کلیم عاجزؔ کی نثر نگاری کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ کچھ لفظوں کو خاص انداز سے لکھتے اور استعمال کرتے ہیں اور ان کی تمام کتابوں میں وہ لفظ اسی انداز سے تحریر کیا ہوا ملے گا، جب کہ عام روش اس سے الگ ہوتی ہے۔ مثلاً وہ 'طالب علم' کو اس کی اصل عربی ترکیب کے مطابق 'طالب العلم' لکھتے ہیں۔ یہ لفظ 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' اور دیگر تصانیف میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے ہر جگہ اسے اسی انداز میں لکھا ہے۔ اسی طرح کلیم عاجزؔ لفظ 'رشتہ دار' کو 'رشتہ مند' لکھتے ہیں۔

اس کی نثر میں لفظوں کے ساتھ 'پن' لاحقہ کا استعمال بھی خوب ہوتا ہے۔ وہ ایسے اسم اور مصادر کا حاصل مصدر یا اشتقاق بنانے کے لئے بھی 'پن' لاحقہ کا استعمال کرتے ہیں، جسے عام طور سے دوسرے انداز میں بغیر 'پن' کے لکھا جاتا ہے، مثلاً 'انسان' سے 'انسانیت'، لکھنے کی بجائے وہ 'انسان پن' لکھتے ہیں۔ کلیم عاجزؔ کی نثر میں 'پن' لاحقہ کے استعمال کا رجحان بڑا عام ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔	سڈول پن	جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی	صفحہ	۱۲۵
۲۔	ساتھ پن	// // //	//	۱۳۷
۳۔	ہنس مکھ پن	// // //	//	۲۲۸
۴۔	بے قابو پن	// // //	//	۲۴۶
۵۔	ٹھنڈا پن	// // //	//	۲۵۶
۶۔	اجاڑ پن	// // //	//	۳۷۶
۷۔	ستھرا پن	// // //	//	۱۲۹
۸۔	ہمسایہ پن	اک دیس اک بدیسی	//	۵۸
۹۔	بے ساختہ پن	// // //	//	۵
۱۰۔	کاروباری پن	// // //	//	۸۲
۱۱۔	انسان پن	یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ	//	۲۲۳
۱۲۔	فرشتہ پن	// // //	//	۲۲۳

مرادفات کی موجزنی

مرادفات کے استعمال سے نثر نگاری میں حسن کے ساتھ موسیقیت اور ایک خاص صوتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ کلیم عاجزؔ کی نثر کا ایک خاص اور نمایاں وصف مرادفات کا بکثرت استعمال بھی ہے۔ کلیم عاجزؔ ایک لفظ کے استعمال کے بعد مطمئن نہیں ہوتے، اس لئے وہ اکثر و بیشتر مرادفات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لئے ان کی ایک فطرت یہ بھی ہے کہ وہ مرکب جملوں میں ایک لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے مرادف الفاظ بڑے حسن اور سلیقے سے پیش کرتے جاتے ہیں جس سے ان کی نثر میں روانی حسن اور موسیقیت یکجا نظر آتی ہیں۔ کلیم عاجزؔ کی نثر کا یہ وصف بہت نمایاں اور عام ہے جسے عام طور سے ہر قاری محسوس کر لیتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

'شہر کے ہنگاموں اور حشرات، چیخ و پکار اور شور و غل کے شباب میں ٹھیک میرے دروازے پر آ کر آواز دیتے۔'

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۱)

'کتنی زنجیریں ہیں، کتنی بیڑیاں ہیں، طوق ہیں، سلاسل ہیں۔'

(یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ-۷۰)

'شیشے اور کانچ، خزف اور صدف، سنگ اور کنکر......سب کے سب ایک رنگ ایک آہنگ......ایک تراش ایک انداز......'

(یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ-۶۲)

'وہ چیز دل شکستگی تھی، دل فگاری تھی، دل خراشی تھی۔'

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۳۱۴)

'مکان ایسے حسین، سجاوٹیں ایسی دلآویز، لباس ایسے دلکش، ادائیں ایسی دل نواز، کھانے ایسے دل پسند، کاریں ایسی دلربا، باتیں ایسی دلچسپ۔'

(اک دیس اک بدیسی-۳۷)

غرض مرادفات کا بکثرت استعمال کلیم عاجزؔ کی نثر نگاری کا ایک خاص اور نمایاں وصف ہے۔ مرادفات کلیم عاجزؔ کی نثر میں موجوں کی طرح اُبھرتے ہیں اور موجوں کا سا حسن اور روانی پیدا کر دیتے ہیں۔

مقفٰی اور مسجّع عبارت

کلیم عاجزؔ چونکہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں اس لئے موزونیت ان کی فطرت کا نمایاں وصف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں بھی شاعری کا لطف اور مزہ آتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر مقامات پر ہم وزن الفاظ لا کر اپنی نثر میں ایک شاعرانہ حسن بکھیر دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ موزوں طبع ہونے کے سبب مقفٰی اور مسجّع عبارات بھی ان کی نثر میں نگینوں کی طرح دمک کر آنکھوں کو خیرہ اور دل کو مسرور کر دیتی ہیں۔

مقفٰی اور مسجّع عبارات عام طور سے قصداً اور ارادے کے ساتھ لکھی جاتی ہیں جس کے سبب ان میں تصنع اور بناوٹ نمایاں ہوتی ہے جس سے ذہن تو ضرور متاثر ہوتا ہے لیکن دل کو مسرت کا احساس نہیں ہوتا اور عبارت دل کی گہرائیوں میں جگہ نہیں پاتی ہے۔ جیسے ''فسانۂ عجائب'' میں مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی مقفٰی و مسجّع عبارت بناوٹی اور بے مزہ لگتی ہے۔ لیکن کلیم عاجزؔ کی نثر میں جب کبھی بھی مقفٰی اور مسجّع عبارات آتی ہیں تو ان میں بھرپور بے ساختگی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ ان میں تصنع یا بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ عبارتیں کہی نہیں گئی ہیں بلکہ خود مصنف کے قلم سے ٹپک پڑی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

'خاک ہی اسے پاک کرتی ہے۔ خاکساری ہی اسے صاحبِ ادراک کرتی ہے۔'

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۸)

'جب جام تھا، جام جم نہیں تھا۔ ساقی کی نظر میں سم نہیں تھا۔ اندیشۂ بیش و کم نہیں تھا'

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۴۴)

'پانکڑ کا سایہ بھی تھا، عید، شب برات اور محرم کا سرمایہ بھی تھا۔ سامنے کھیتوں میں ہریالی بھی تھی۔ افق کی لالی بھی تھی......'

'دوست کہلواتے رہے، بزرگ اور مہربان غزل لکھواتے رہے۔ اپنی دلچسپی کا سامان مہیا فرماتے رہے۔ پڑھ کر سر دھنتے رہے، مسکراتے رہے۔ میری گرانی اور بدمزگی کو خیال میں نہ لاتے رہے......'

'اپنوں نے ستایا، غیروں نے رُلایا، وقت نے لڑکھڑایا، حادثوں نے تھرتھرایا، دشمنوں نے ہوش اُڑایا، دوستوں نے دیوانہ بنایا۔ مگر کلیم اپنی غزل خوانی سے باز نہ آیا۔'

(مقدمہ: جب فصل بہاراں آئی تھی-صفحہ: ۳۶، ۳۷، ۷۸)

'ایک رنگ ایک آہنگ......ایک تراش ایک انداز......ایک مقصد ایک مراد......ایک نالہ ایک فریاد......آج اسی لباس اسی انداز میں ولی بھی ہے اور شیطان بھی۔ رند بادہ خوار بھی اور زاہد شب زندہ دار بھی۔ متقی بھی اور بدکردار بھی۔ صوفی بھی گنہگار بھی۔'

(یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ-۶۲)

کلیم عاجزؔ کبھی کبھی ہم وزن الفاظ کی تکرار سے نثر میں موسیقیت کا جادو جگا دیتے ہیں:

'سیدھا سادا، اَن پڑھ دیہاتی......حال کے اعتبار سے نا قابل توجہ......قال کے اعتبار سے نا قابل اعتناء......جمال کے اعتبار سے نا قابل نظر......اور کمال کے اعتبار سے اتنا بلند کہ ہم اگر آنکھ اُٹھا کر اسے دیکھنا چاہتے تو ہمارے سروں سے کلاہیں گر پڑتیں۔'

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۱۰۰)

مرقع نگاری

'مرقع نگاری' یعنی 'لفظی تصویر کشی' ایک فن ہے۔ نہایت ہی نازک اور مشکل فن۔ یہ نگاہِ تیز بیں، مضبوط حافظے اور زبردست قوتِ بیان کا متقاضی ہے۔ مرقع کشی کے وقت مصنف کا قلم کسی مصور کے رنگا رنگ برش سے کم نہیں ہوتا ہے۔ محمد حسین آزادؔ کی مشہور زمانہ تصنیف 'آبِ حیات' اپنی جن خوبیوں کے سبب مشہور و مقبول ہوئی، ان میں ایک خوبی کامیاب مرقع کشی بھی ہے۔ آزادؔ نے 'آبِ حیات' میں شاعروں کی خوبصورت، دلچسپ اور کامیاب مرقع کشی کی ہے۔ لیکن آزادؔ کے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ انہیں ایسے شعراء کی بھی مرقع کشی کرنی پڑی ہے، جنہیں انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ ایسی صورت حال میں تخیلات کے سہارے بنائی گئی یہ تصویریں کامیاب تو ضرور کہی جاسکتی ہیں، لیکن ان میں زندگی، دلکشی اور اصلیت نہیں ہے۔

کلیم عاجزؔ ایک ایسے نثر نگار ہیں جنہیں مرقع کشی سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

مرقع کشی کے نمونے ان کی نثر میں عام نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مرقع کشی کو ایک فن کی طرح برتا ہے اور اپنی تصانیف میں انہیں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔

مرقع کشی کے معاملے میں کلیم عاجزؔ کا قلم کسی مصور کے برش سے کم نظر نہیں آتا ہے۔ وہ یادداشت کے خزانے سے شخصیتوں کو نکالتے ہیں اور انہیں الفاظ کے سہارے اس طرح مجسم کردیتے ہیں کہ تخیلات سنیما کے پردے کی طرح آنکھوں کے سامنے متشکل ہوجاتے ہیں۔ تصور، تصویر بن جاتی ہے اور پرچھائیوں پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ کلیم عاجزؔ کا بڑا کمال ہے۔ یادداشت اور الفاظ کے سہارے تخیلات کی رنگ آمیزی سے بنائی ہوئی کلیم عاجزؔ کی یہ زندہ اور متحرک تصویریں ان کی پوری نثر میں زندگی اور حلاوت پیدا کرنے کے ساتھ انہیں دلکش اور زندۂ جاوید کردیتی ہیں۔ کلیم عاجزؔ کی لفظی تصویر کشی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

'ایک بھدیسل قسم کا انسان...... پچاس پچپن کی عمر...... پانچ فٹ کا کوتاہ قد، کچھ بھاری بدن...... ہاتھ پاؤں عجیب بے ڈول قسم کے...... سر منڈا ہوا۔ کچّی پکّی بے ترتیب اُلجھی داڑھی، سر پر چنّخ ٹوپی...... اس کے کنارے گُمچھا لپیٹا ہوا...... جٹ کا میلا کرتا اور گیروئے رنگ کی رنگی ہوئی مارکین کی لنگی...... پاؤں میں دیہاتی چمرواجوتا۔ ہاتھ میں چار فٹ کی ٹیڑھی بکوڑی لاٹھی...... بغل میں کپڑوں کا ایک بقچہ...... یوں آرہے ہیں جیسے چلا نہیں جارہا ہے۔ پاؤں گھسٹ رہا ہے اور مٹی پر جوتے کے گھسر گھسر گھسر گھسنے کی تیز آواز...... یہ گھسّو خلیفہ ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ بے حد پان کھائے ہوئے ہیں اور پیک دہن کے دونوں کناروں سے بہہ کر داڑھی کے بالوں کو تر کررہی ہے۔'

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی-۹۸)

کیسی مکمل اور متحرک تصویر ہے۔ بے ڈول جسم، بے ڈھنگی چال، دہن کے دونوں کناروں سے بہتی ہوئی پیک۔ کچی پکی بہت اُلجھی ہوئی داڑھی، سر پر ٹوپی اور گمچھا۔ جٹ کا میلا کرتا، گیروئے رنگ کی لنگی، پاؤں میں چمرواجوتا۔ ہاتھ میں ٹیڑھی میڑھی لاٹھی...... گھسّو خلیفہ ہمارے سامنے مجسم ہوگئے ہیں۔

غرض کلیم عاجزؔ ایک ماہر مصور کی طرح لفظی تصویر کی مدد سے اپنے کرداروں کو ہمارے سامنے مجسم کردیتے ہیں اور ڈوب کر پڑھنے والے ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتے ہیں۔

یہ کلیم عاجزؔ کی مرقع نگاری کا کمال ہے۔

مندرجہ بالا اوصاف کے علاوہ کلیم عاجزؔ کی نثر نگاری کے دو وصف اور ہیں — پہلا، بولیوں کا استعمال اور دوسرا، اشعار کی شمولیت۔ بولیوں کے استعمال کے سلسلے میں ایک مضمون الگ سے تحریر کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیم عاجزؔ نے اپنی نثر نگاری میں بولیوں کے استعمال کو شعوری طور پر یا بے ساختگی کے سبب راہ دی ہے اور اردو نثر نگاری میں 'بولیوں' کے استعمال کے امکانات کو روشن کیا ہے۔

اشعار کا استعمال کلیم عاجزؔ کی نثر کا ایک اور خاص وصف ہے۔ وہ جگہ بہ جگہ اشعار کے استعمال سے نثر میں ایک خاص لطف پیدا کردیتے ہیں اور اپنی شاعرانہ طبیعت کا بھرپور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ نثر کے درمیان استعمال ہونے والے یہ اشعار، نثر میں رُکاوٹ یا دھیماپن نہیں لاتے بلکہ وہ نگینوں کی طرح چمک اُٹھتے ہیں۔

کلیم عاجزؔ کی نثر میں استعمال ہونے والے بیشتر اشعار ان کے اپنے ہی ہوا کرتے ہیں یا پھر علامہ اقبالؒ کے۔ وہ میرؔ، غالبؔ یا دوسرے شعراء کے اشعار بہت ہی کم نقل کرتے ہیں۔ کلیم عاجزؔ کی نثر میں آنے والے اشعار ان کی باتوں کی یا تو تشریح کرتے ہیں یا اجمال۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشعار بڑے بھلے اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا اوصاف کلیم عاجزؔ کی نثر کے وہ اوصاف ہیں جن کے مجموعی امتزاج سے ان کے اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے اور انہیں سے کلیم عاجزؔ کے طرز کی شناخت کی جاسکتی ہے اور یہی اوصاف انہیں ایک صاحبِ طرز نثر نگار کی حیثیت عطا کرتے ہیں۔ بلا شبہ کلیم عاجزؔ کی نثر کے متذکرہ بالا اوصاف کی بنیاد پر انہیں ایک صاحب طرز نثر نگار کہنا ایک سچائی کا اعتراف ہوگا۔

انتخابِ کلام عاجزؔ

غزل

خوشی ہے کیا کسی آوارۂ وطن کے لئے
بہار آئی تو آیا کرے چمن کے لئے
نہ لالہ و گل و نسریں نہ نسترن کے لئے
مٹے ہیں ہم کسی غارت گر چمن کے لئے
کبھی جو گوشۂ خلوت میں شمع ہاتھ آئی
لپٹ کے رو لئے یارانِ انجمن کے لئے
ہم اُن سے شکوۂ بیداد کیا کریں عاجزؔ
یہاں تو پاسِ وفا قفل ہے دہن کے لئے

غزل

حقیقتوں کا جلال دیں گے، صداقتوں کا جمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے
تپش پتنگوں کو بخش دیں گے لہو چراغوں میں ڈھال دیں گے
ہم اُن کی محفل میں رہ گئے ہیں تو اُن کی محفل سنبھال دیں گے
نہ بندۂ عقل و ہوش دیں گے نہ اہلِ فکر و خیال دیں گے
تمہاری زلفوں کو جو درازی تمہارے آشفتہ حال دیں گے
یہ عقل والے اسی طرح سے ہمیں فریبِ کمال دیں گے
جنوں کے دامن سے پھول چُن کر خرد کے دامن میں ڈال دیں گے
ہماری آشفتگی سلامت سلجھ ہی جائے گی زلفِ دوراں
جو پیچ وخم رہ گیا ہے باقی وہ پیچ وخم بھی نکال دیں گے
جناب شیخ اپنی فکر کیجئے کہ اب یہ فرمانِ برہمن ہے
بتوں کو سجدہ نہیں کرو گے تو بُت کدے سے نکال دیں گے

غزل

مقدّر میں اگر بد نام ہی ہونا ہے ہولیں گے
جو آئے جس کے جی میں بول لے ہم کچھ نہ بولیں گے
اگر چاہے گا جی اپنا تو خود آزاد ہولیں گے
یہ اہلِ ہوش کیا دیوانوں کی زنجیریں کھولیں گے
وہ سوداگر ہیں تو سوداگری ہم کو بھی آتی ہے
وفا کو وہ جو پرکھیں گے کرم کو ہم بھی تولیں گے
ہمیں تو اے خرد دار و رسن کی سمت جانا ہے
اگر موقع ملے گا تیرے کوچے سے بھی ہولیں گے
متاعِ درد سے ہے انجمن کی انجمن خالی
یہ شئے ہم بانٹتے ہیں اہلِ محفل سے کہو لیں گے؟
کچھ اہلِ عشق نے اک کارواں اپنا بنایا ہے
وہی پہنچیں گے منزل تک جو اِن کے ساتھ ہو لیں گے
چلیں ہنس بول لیں کچھ دیر بزمِ دوست میں عاجزؔ
اگر اُمڈے گا دل، جا کر کسی گوشے میں رولیں گے

غزل

پڑھنے کو غزل عاجزؔ محفل میں جب آئے ہے
اپنے بھی وہ روئے ہے ہم کو بھی رُلائے ہے
کیا کھیل محبت بھی کھیلے ہے کھلائے ہے
ہارے ہے سو جیتے ہے کھوئے ہے سو پائے ہے
جب سے ترے دیوانے نکلے تری محفل سے
کیا حال ہے محفل کا دیکھا نہیں جائے ہے
شاعر تو نہیں عاجزؔ سائل ہے محبت کا
کشکول غزل لے کر آواز لگائے ہے

غزل

تم گل تھے ہم نکھار ابھی کل کی بات ہے
ہم سے تھی سب بہار ابھی کل کی بات ہے
بیگانہ سمجھو، غیر کہو، اجنبی کہو
اپنوں میں تھا شمار ابھی کل کی بات ہے
آج اپنے پاس سے ہمیں رکھتے ہو دُور دُور
ہم بن نہ تھا قرار ابھی کل کی بات ہے
اِترا رہے ہو آج پہن کر نئی قبا
دامن تھا تار تار ابھی کل کی بات ہے
آج اس قدر غروریہ انداز یہ مزاج
پھرتے تھے میر خوار ابھی کل کی بات ہے
انجان بن کے پوچھتے ہو ہے یہ کب کی بات
کل کی ہے بات یار، ابھی کل کی بات ہے

غزل

اس ناز اِس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو
دیوانۂ گل قیدیِ زنجیر ہیں اور تم
کیا ٹھاٹ سے گلشن کی ہوا کھائے چلو ہو
مئے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو
ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا
تم کیا ہو تمہیں سب سے کہلوائے چلو ہو
زُلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن مرے پیارے

زُلفوں سے زیادہ تمہیں بل کھائے چلو ہو
وہ شوخ ستمگر تو ستم ڈھائے چلے ہے
تم ہو کہ کلیمؔ اپنی غزل گائے چلو ہو

غزل

چاہ کا معیار اُونچا چاہیے
جو نہ چاہیں اُن کو چاہا چاہیے
کون چاہے ہے کسی کو بے غرض
چاہنے والوں سے بھاگا چاہیے
ہم تو کچھ چاہے ہیں تم چاہو ہو کچھ
وقت کیا چاہے ہے دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں تیرے ہی دامن کی خیر
ہم ہیں دیوانے ہمیں کیا چاہیے
بے رُخی بھی ناز بھی انداز بھی
چاہیۓ لیکن نہ اتنا چاہیے
بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

غزل

میرے ہی لہو پر گزر او •قات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو
دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکے ملو دور سے کیا بات کرو ہو
ہم کو جو ملا ہے وہ تمہیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمہیں ؟ کیا بات کرو ہو

یوں تو کبھی منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
بکنے بھی دو عاجز کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

غزل

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا
غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا
کوئی نہ دردِ جہاں کو غزل بنائے گا
یہ بوجھ اُسی پہ پڑا ہے وہی اُٹھائے گا
غموں کے بوجھ سے کانپے گا تھرتھرائے گا
مگر مزاج جو پوچھوگے مسکرائے گا
زمانہ لاکھ اُسے تڑپائے گا رُلائے گا
وہ مرثیہ نہ کہے گا غزل ہی گائے گا
اُسی نے دل کو جلایا ہے روشنی کے لئے
جو دل جلا نہ سکا شمع کیا جلائے گا

غزل

وہ محفل وہ چمن وہ پھول وہ شبنم نہیں پیارے
جو سچ پوچھو غزل کہنے کا یہ موسم نہیں پیارے
کسی گلشن میں یہ چھڑکاؤ کا عالم نہیں پیارے
تمام آنسو ہی آنسو ہیں کہیں شبنم نہیں پیارے
کرشموں سے تمہارے بے خبر بھی ہم نہیں پیارے

حرم سے دور جو بیٹھے ہیں نا محرم نہیں پیارے
تری محفل میں کِس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میؔر سے کچھ کم نہیں پیارے
ادھر آ ہم دِکھاتے ہیں غزل کا آئینہ تجھ کو
یہ کس نے کہہ دیا گیسو ترے برہم نہیں پیارے
قیامت میں بھی ہوگا ایک ہی کے حسن کا جلوہ
قیامت سے ترا عہدِ جوانی کم نہیں پیارے
چمن سے دونوں کا رشتہ ہے لیکن فرق کتنا ہے
خزاں میں تم نہیں تھے فصلِ گل میں ہم نہیں پیارے
چھپایا ہے جسے ہم نے غزل خوانی کے پردے میں
بہت ڈھونڈھا کہیں اس زخم کا مرہم نہیں پیارے

غزل

اس کی فکر نہ کیجیو عاجؔز کون یہاں کیا بولے ہے
کرنے والا کام کرے ہے بولنے والا بولے ہے
بنسی تو اِک لکڑی ٹھہری لکڑی بھی کیا بولے ہے
بنسی کے پردے میں پیارے کرشن کنہیا بولے ہے
گھر کی باتیں گھر کے باہر بھیدی گھر کا بولے ہے
دل تو ہے خاموش بچارا لیکن چہرہ بولے ہے
وقت آئے تو اہلِ چمن بھی اہلِ زباں بن جاتے ہیں
ڈالی ڈالی جو بیتی ہے پتا پتا بولے ہے
اب تک شعر و غزل میں ان کی گونج رہی ہیں آوازیں
صحرا سے مجنوں بولے ہے شہر سے لیلا بولے ہے
ہم نے سسک کر دم توڑا ہے جس قاتل کے پاؤں تلے
آج اُسی کے سر پر چڑھ کر خون ہمارا بولے ہے

غزل

چھُری جن کے ہاتھوں سے کھانا پڑے ہے
غزل بھی اُنہیں کو سنانا پڑے ہے
طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے
اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے
خبر ہے کہ ہیں دُشمنِ جاں و دل وہ
مگر دل اُنھیں سے لگانا پڑے ہے
عجب چیز ہے کاروبارِ محبت
کمانا پڑے ہے لُٹانا پڑے ہے
نہ آدرد مندوں کی محفل میں پیارے
یہاں عمر بھر دل جلانا پڑے ہے
ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی
وہی فصلِ گل کا زمانہ پڑے ہے
بس اِک بات ان کی چھپانے کی خاطر
ہمیں بات کیا کیا بنانا پڑے ہے
کچھ آساں نہیں منصبِ سرخ روئی
کئی بار مقتل میں جانا پڑے ہے
وہ پوچھے ہیں جب خیریت سے ہو عاجز
جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

غزل

آنکھوں میں کہیں آنسو نہ رہے سینے میں کسی کے دل نہ رہا
ہیں شہر میں قاتل ہی قاتل سنتے ہیں کوئی بسمل نہ رہا
مت کہئے کہ اب مجنوں نہ رہا لیلیٰ نہ رہی محمل نہ رہا
کہئے کہ لہو کا کھیل ہے یہ اور اتنا لہو فاضل نہ رہا
محرومیِ اہلِ محفل کا کب ذکر سرِ محفل نہ رہا

پہلے تو یہ غم تھا دل نہ رہا اب غم ہے کہ دردِ دل نہ رہا
کیا اہلِ خرد کیا اہلِ جنوں بے ساز ہیں سب بے سوز ہیں سب
بستی بھی کسی لائق نہ رہی صحرا بھی کسی قابل نہ رہا
جانے کہ نہ جانے اور کوئی ہم تو اسے جانے ہیں جس نے
قاتل کا ہمیشہ کام کیا اور نام کبھی قاتل نہ رہا
دہلی میں بہار آئی عاؔجز افسوس جناب میرؔ نہیں
جب زخم رہا مرہم نہ رہا مرہم ہے تو زخمِ دل نہ رہا

غزل

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے
وہ آگئے روشِ میر کی غزل والے
جگر کا خون نہ دیتے اگر غزل والے
تو یار تم بھی نہ کہلاتے پھول پھل والے
یہ درد والے یہ دل والے یہ غزل والے
یہی ہیں تیری گلی کی چہل پہل والے
یہ دیکھ کر کبھی ملتے نہیں غزل والے
کہ لوگ جھونپڑے والے ہیں یا محل والے
قلم لئے ہیں نئی شان سے غزل والے
نصیب جس کو بدلوانا ہے بدلوالے
ہمارے حال پہ او ابروؤں پہ بل والے
تو اپنی زلفوں کا تو پیچ و خم نکلوالے
یہ بات ہم سے جو چاہے جہاں کہلوالے
ڈبونے والے یہی ہیں اَغل بغل والے
خزاں بھی دیکھی تھی فصلِ بہار بھی دیکھی
ہیں آج والے بھی ویسے ہی جیسے کل والے
یہ بات اب تو زمانے کو ہو چکی معلوم

کہ تم ہو دار و رسن والے ہم غزل والے
یہ حق کلیم کے محبوب ہی کو حاصل ہے
کہ روز زخم دے روز اِک غزل کہلوالے
بہت سنبھال کے رکھا ہے بوریا ہم نے
کبھی تو جھونپڑے میں آئیں گے محل والے

غزل

جب بھی تیری نظروں نے شہ دل کو ذرا دی ہے
کہہ دی ہے غزل ہم نے، اور تجھ کو سنا دی ہے
رنگوں کی ہنر مندی لفظوں میں چھپا دی ہے
جو بات بھی کہہ دی ہے، تصویر بنا دی ہے
اے صنفِ غزل تیری توقیر بڑھا دی ہے
تو اور جواں ہوگی، جا میں نے دُعا دی ہے
ہر سمت ڈھنڈھورا ہے، ہر سو یہ منادی ہے
عاجز کو خوشی مت دو، وہ درد کا عادی ہے
تاعمر جگر تھامے رونے کی سزا دی ہے
واللہ ستمگر نے کیا دادِ وفا دی ہے
زخموں کو کسی نے بھی مرہم نہ دوا دی ہے
ہر کنڈی ہلائی ہے، ہر در پہ صدا دی ہے
ہشیاروں کے جھرمٹ میں بارات چلی زنداں
زنجیریں غزل خواں ہیں دیوانے کی شادی ہے
دل جلنے کا افسانہ پوچھو گے تو کہہ دوں گا
انگارہ رکھا کس نے، اور کس نے ہوا دی ہے
دیوانِ غزل عاؔجز ایوانِ چراغاں ہے
اِک شعر نہیں لکھا، اِک شمع جلا دی ہے

غزل

ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ چپ رہنے سے کیا ہوگا
کچھ لوگ تو خوش ہوں گے، وہ ہوگا خفا ہوگا
حشر اہلِ محبت کا جو ہوتا رہا ہوگا
دِل جوڑوگے گر دل سے، سر تن سے جدا ہوگا
جو زخم بھی وہ دیں گے، ہر زخم نیا ہوگا
آج اور مزا آیا، کل اور مزا ہوگا
ہونے کو ستم یوں تو کیا کیا نہ ہوا ہوگا
جیسا کہ ہوا ہم پر، ایسا نہ ہوا ہوگا
افسانۂ دل ہم سا کب کس نے کہا ہوگا
دل تھام لیا ہوگا ، جس نے بھی سنا ہوگا
یہ معجزہ شاعر سے اے بادِ صبا ہوگا
ہر پھول تر و تازہ ہر بوٹا ہرا ہوگا
ہم اہلِ محبت ہیں ، تاثیر بدل دیں گے
وہ زہر بھی گر دیں گے، اس میں بھی مزا ہوگا
ہر دَور میں دشمن کو ہم نے یہ دُعا دی ہے
تو نے تو بُرائی کی، جا تیرا بھلا ہوگا
شمشیر بکف قاتل اشعار بلب شاعر
تلواروں کا جرمانہ غزلوں سے ادا ہوگا

غزل

خرد کی جو فراوانی ہوئی ہے
ہمیں سے کوئی نادانی ہوئی ہے
بڑی ہوشیار بنتی پھر رہی ہے
یہ دنیا کیسی دیوانی ہوئی ہے
تحمّل غم کا جب مشکل ہوا ہے

غزل کہنے میں آسانی ہوئی ہے
سبب رنجش کا ان سے پوچھ لیں گے
اگرچہ بات تو جانی ہوئی ہے
کسی محفل میں چھپ سکتے نہیں ہم
کہ یہ آواز پہچانی ہوئی ہے
ذرا دیکھو تو رنگِ لالہ و گل
لہو کی کتنی ارزانی ہوئی ہے
ہزاروں سال بھی گر ہم جئیں گے
وہی ہوگی جو نادانی ہوئی ہے
ہے میری سیدھی سادی بات لیکن
زمانے بھر کو حیرانی ہوئی ہے
غزل پڑھنے کو ہے عاجزؔ، یہ سن کر
انہیں کیا کیا پریشانی ہوئی ہے

غزل

خدایاغزل کا اگر ساز دینا
مجھے میرؔصاحب کا انداز دینا
وہ لہجہ جو ہے قابلِ ناز دینا
وہی سوز دینا، وہی ساز دینا
وہ آہنگ دینا اتر جائے دل میں
کلیجے کو چھولے وہ آواز دینا
مرے پاس کہنے کی باتیں بہت ہیں
مجھے بات کہنے کا انداز دینا
مجھے آسمانوں میں اڑنا نہیں ہے
دلوں کی فضاؤں میں پرواز دینا
غزل درد انگیز چھیڑی ہے ہم نے

ذرا درد والوں کو آواز دینا
بدل جائیں گی دوریاں قربتوں میں
میں آواز دوں گا تم آواز دینا
میں تنہا کلامی سے گھبرا گیا ہوں
مجھے کوئی یارب ہم آواز دینا
تمہیں جب ضرورت ہو خون جگر کی
میں آجاؤں گا مجھ کو آواز دینا
نئی شاعری شاعری ہی نہیں ہے
نئے شاعروں کو پھر آواز دینا
میں پھر اپنے اشعار میں جی اٹھا ہوں
مرے قاتلوں کو پھر آواز دینا
بہت خوش ہے عاجزؔ فقیری میں اپنی
اُسے کوئی عہدہ نہ اعزاز دینا

انتخاب از : جب فصلِ بہاراں آئی تھی

غزل

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا
غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا
کوئی نہ دردِ جہاں کو غزل بنائے گا
یہ بوجھ اُسی پہ پڑا ہے وہی اُٹھائے گا
غموں کے بوجھ سے کانپے گا تھرتھرائے گا
مگر مزاج جو پوچھوگے مسکرائے گا
زمانہ لاکھ اُسے تڑپائے گا رُلائے گا
وہ مرثیہ نہ کہے گا غزل ہی گائے گا

اُسی نے دل کو جلایا ہے روشنی کے لئے
جو دل جلا نہ سکا شمع کیا جلائے گا

غزل

وہ محفل وہ چمن وہ پھول وہ شبنم نہیں پیارے
جو سچ پوچھو غزل کہنے کا یہ موسم نہیں پیارے
کسی گلشن میں یہ چھڑکاؤ کا عالم نہیں پیارے
تمام آنسو ہی آنسو ہیں کہیں شبنم نہیں پیارے
کرشموں سے تمہارے بے خبر بھی ہم نہیں پیارے
حرم سے دور جو بیٹھے ہیں نا محرم نہیں پیارے
تری محفل میں کِس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میرؔ سے کچھ کم نہیں پیارے
ادھر آہم دِکھاتے ہیں غزل کا آئینہ تجھ کو
یہ کس نے کہہ دیا گیسو ترے برہم نہیں پیارے
قیامت میں بھی ہوگا ایک ہی کے حسن کا جلوہ
قیامت سے ترا عہدِ جوانی کم نہیں پیارے
چمن سے دونوں کا رشتہ ہے لیکن فرق کتنا ہے
خزاں میں تم نہیں تھے فصلِ گل میں ہم نہیں پیارے
چھپایا ہے جسے ہم نے غزل خوانی کے پردے میں
بہت ڈھونڈھا کہیں اس زخم کا مرہم نہیں پیارے

غزل

چھُری جن کے ہاتھوں سے کھانا پڑے ہے
غزل بھی اُنہیں کو سنانا پڑے ہے
طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے
اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے
خبر ہے کہ ہیں دشمنِ جاں و دل وہ

مگر دل اُنھیں سے لگانا پڑے ہے
عجب چیز ہے کاروبارِ محبت
کمانا پڑے ہے لُٹانا پڑے ہے
نہ آدرد مندوں کی محفل میں پیارے
یہاں عمر بھر دل جلانا پڑے ہے
ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی
وہی فصلِ گل کا زمانہ پڑے ہے
بس اِک بات ان کی چھپانے کی خاطر
ہمیں بات کیا کیا بنانا پڑے ہے
کچھ آساں نہیں منصبِ سرخ روئی
کئی بار مقتل میں جانا پڑے ہے
وہ پوچھے ہیں جب خیریت سے ہو عاجزؔ
جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

غزل

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے
وہ آگئے روشِ میر کی غزل والے
جگر کا خون نہ دیتے اگر غزل والے
تو یار تم بھی نہ کہلاتے پھول پھل والے
یہ درد والے یہ دل والے یہ غزل والے
یہی ہیں تیری گلی کی چہل پہل والے
یہ دیکھ کر کبھی ملتے نہیں غزل والے
کہ لوگ جھونپڑے والے ہیں یا محل والے
قلم لئے ہیں نئی شان سے غزل والے
نصیب جس کو بدلوانا ہے بدلوالے
ہمارے حال پہ او ابروؤں پہ بل والے
تو اپنی زلفوں کا تو پیچ و خم نکلوالے

یہ بات ہم سے جو چاہے جہاں کہلوالے
ڈبونے والے یہی ہیں اَغل بغل والے
خزاں بھی دیکھی تھی فصلِ بہار بھی دیکھی
ہیں آج والے بھی ویسے ہی جیسے کل والے
یہ بات اب تو زمانے کو ہو چکی معلوم
کہ تم ہو دار و رسن والے ہم غزل والے
یہ حق کلیمؔ کے محبوب ہی کو حاصل ہے
کہ روز زخم دے روز اِک غزل کہلوالے
بہت سنبھال کے رکھا ہے بوریا ہم نے
کبھی تو جھونپڑے میں آئیں گے محل والے

غزل

آنکھوں میں کہیں آنسو نہ رہے سینے میں کسی کے دل نہ رہا
ہیں شہر میں قاتل ہی قاتل سنتے ہیں کوئی بسمل نہ رہا
مت کہئے کہ اب مجنوں نہ رہا لیلیٰ نہ رہی محمل نہ رہا
کہئے کہ لہو کا کھیل ہے یہ اور اتنا لہو فاضل نہ رہا
محرومیِ اہلِ محفل کا کب ذکر سرِ محفل نہ رہا
پہلے تو یہ غم تھا دل نہ رہا اب غم ہے کہ دردِ دل نہ رہا
کیا اہلِ خرد کیا اہلِ جنوں بے ساز ہیں سب بے سوز ہیں سب
بستی بھی کسی لائق نہ رہی صحرا بھی کسی قابل نہ رہا
جانے کہ نہ جانے اور کوئی ہم تو اسے جانے ہیں جس نے
قاتل کا ہمیشہ کام کیا اور نام کبھی قاتل نہ رہا
دہلی میں بہار آئی عاجزؔ افسوس جناب میرؔ نہیں
جب زخم رہا مرہم نہ رہا مرہم ہے تو زخمِ دل نہ رہا

غزل

کل کہتے رہے ہیں وہی کل کہتے رہیں گے
ہر دَور میں ہم اُن پہ غزل کہتے رہیں گے
ہر صبح کو کہتے رہیں گے صبحِ قیامت

ہر شام کو ہم شامِ غزل کہتے رہیں گے
وہ باتیں بناتے رہیں گے اور ہم اُن سے
کیا قول ہے کیا ان کا عمل کہتے رہیں گے
چھپ چھپ کے جو کرتے رہیں گے اہلِ سیاست
کھل کر سر بزم اہلِ غزل کہتے رہیں گے
وہ ہم کو بدلنے کو کہے جائے گا اور ہم
یہ شیوۂ گفتار بدل، کہتے رہیں گے
ہر ایک قدم پر اس آوارہ قدم کو
ہاں دیکھ کے چل دیکھ کے چل کہتے رہیں گے
دل گرچہ ہے ٹوٹی ہوئی پھوٹی ہوئی کٹیا
اس کٹیا کو ہم تاج محل کہتے رہیں گے
گردن زدنی کہتے رہیں گے اسے کچھ لوگ
ہم لوگ غزل گو ہیں غزل کہتے رہیں گے

غزل

شانے کا بہت خونِ جگر جائے ہے پیارے
تب زُلف کہیں تابہ کمر جائے ہے پیارے
جس دن کوئی غم مجھ پہ گذر جائے ہے پیارے
چہرہ ترا اس روز نکھر جائے ہے پیارے
بڑھ جائے ہے جس دن میری آشفتگیِ حال
اس دن تری زُلف اور سنور جائے ہے پیارے
اک گھر بھی سلامت نہیں اب شہرِ وفا میں
تو آگ لگانے کو کدھر جائے ہے پیارے
رہنے دے جفاؤں کی کڑی دھوپ میں مجھ کو
سائے میں تو ہر شخص ٹھہر جائے ہے پیارے
وہ بات ذرا سی جسے کہتے ہیں غمِ دل
سمجھانے میں اِک عمر گذر جائے ہے پیارے

ہر چند کوئی نام نہیں میری غزل میں
تیری ہی طرف سب کی نظر جائے ہے پیارے

غزل

شاعر کے بغیر اس دنیا کا سانچے میں اترنا مشکل ہے
جب تک نہ ہو آگے آئینہ زُلفوں کا سنورنا مشکل ہے
بے جان ہوائے صحن چمن بے کیف سزائے دار ورسن
ہوشیاروں کو جینا مشکل ہے دیوانوں کو مرنا مشکل ہے
اب پیار سے ہم کو مت روکو یہ پیار وہ دریا ہے پیارے
اِک بار جو اس میں ڈوب گیا پھر اس کا اُبھرنا مشکل ہے
اے اہلِ دیارِ دار و رسن کا ہے کو پکارو ہو ہم کو
ہم دور کے جانے والوں کا رستے میں ٹھہرنا مشکل ہے
ہم جس میں ہمیشہ رہتے ہیں دہکی ہوئی غزلیں کہتے ہیں
اُس درد کی بھٹّی سے ہو کر اَوروں کو گزرنا مشکل ہے
اِک دن جو گریباں چاک ہوئے اُس دن سے گریباں چاک ہیں ہم
یہ نشۂ دردِ دل ہے میاں یہ نشّہ اُترنا مشکل ہے
لیتے جو بہت ہیں نامِ وفا کیا جانیں وہ سرِ انجام وفا
جن کے لئے کہنا آساں ہے ان کے لئے کرنا مشکل ہے

غزل

یہ رنگ اشکوں کا جو لال لال ہے پیارے
بتارہاہے کہ کیا دل کا حال ہے پیارے
سجا ہوا جو تیرا بال بال ہے پیارے
زمانہ اور بھی آشفتہ حال ہے پیارے
اب اور چاہئے سامان کیا غزل کے لئے
میں خوش بیان ہوں تو خوش جمال ہے پیارے
خبر نہ تھی کہ میری اتنی قدر و قیمت ہے

مجھے مٹا کے تو کتنا نہال ہے پیارے
وہی تو عمر میرے درد دل کی بھی ہوگی
تیرے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے
سنا ہے جلتے ہی رہنا ہے زندگی دل کی
تو صبح و شام کا پھر کیا سوال ہے پیارے
میرے علاوہ بھی ہیں تجھ کو چاہنے والے
یہ واقعہ نہیں تیرا خیال ہے پیارے
فضائے چرخ پہ اُڑنا کوئی بڑائی نہیں
کسی کے دل میں اُترنا کمال ہے پیارے
نہ جانے کیا کیا سکھاتے پڑھاتے رہتے ہیں
وہ لوگ جن سے تیری بول چال ہے پیارے
ابھی کلیم کو پہچانتا نہیں کوئی
یہ اپنے وقت کی گدڑی میں لال ہے پیارے

غزل

جوانی میں تھا کیا اس شوخ کا عالم نہ بھولیں گے
زمانہ بھول جائے بھول جائے ہم نہ بھولیں گے
دیا ہے تم نے غم ایسی ادا سے اس سلیقے سے
کہ سب کچھ بھول جائیں گے تمہارا غم نہ بھولیں گے
یہی تاریخ کہتی ہے یہی حالات کہتے ہیں
عداوت تم نہ بھولو گے محبت ہم نہ بھولیں گے
بھلا ہم کیسے بھولیں گے ترے گیسوئے برہم کو
مگر ہم کوبھی تیرے گیسوئے برہم نہ بھولیں گے
ترے آنے پہ جو گزری قیامت یاد ہے سب کو
ترا جانا جو برپا کر گیا ماتم نہ بھولیں گے

انتخاب از : ہاں چھیڑو غزل عاؔجز

غزل

(تیلہاڑا میں گنج شہیداں کے قریب بیٹھ کر لکھی گئی غزل)

پھر آج درد کی بھٹی میں جل کے آئے ہیں
پگھل کے آئے ہیں، سانچے میں ڈھل کے آئے ہیں
یہ ہم جو شہر سے آئے ہیں گاؤں عید کے دن
پرانے گھر نئے گھر سے نکل کے آئے ہیں
منانے ہم بھی شہیدوں کا جشن سالگرہ
بغل میں لے کے سفینے غزل کے آئے ہیں
ہمارے گاؤں میں مجمع ہے سرخ پوشوں کا
شہانا عید کا جوڑا بدل کے آئے ہیں
ہماری ماں کو ہماری بہن کو ساتھ لئے
شہیدِ ناز اغل کے بغل کے آئے ہیں
ہر ایک کی ہے زباں پر کہ ہاں سناؤ کلیم
ہم اشتیاق میں تازہ غزل کے آئے ہیں
کسے مجال ہو انکار کی وہ جب یہ کہیں
میاں ترے لئے جنت سے چل کے آئے ہیں
سنادی میں نے غزل اور سنادی یوں
کہ سب کے چہرے کی رنگت بدل کے آئے ہیں
کوئی تڑپ گیا، دل تھامے کوئی لوٹ گیا
کسی کی آنکھوں میں آنسو مچل کے آئے ہیں
بلائیں لینے کو جب ماں کی انگلیاں اُٹھیں
ان انگلیوں کو ہم آنکھوں سے مَل کے آئے ہیں

بہن کے پھیلے ہوئے لال لال آنچل میں
ہم اپنے اشکوں کے سب پھول اُچھل کے آئے ہیں
ان آنے والوں نے سب درد و غم نچوڑ لیا
گراں گراں گئے تھے ہلکے ہلکے آئے ہیں
گو ان شہیدوں کی تربت پہ جھونپڑا بھی نہیں
ہمیں تو لطف بہشتی محل کے آئے ہیں
ہماری شاعری کے اصل قدر داں ہیں وہی
وہیں مزے ہمیں شعر و غزل کے آئے ہیں
ہمارے شعروں کو گھر دوسرا نہیں معلوم
یہ دل میں جائیں گے دل سے نکل کے آئے ہیں

غزل

جب بھی تیری نظروں نے شہ دل کو ذرا دی ہے
کہہ دی ہے غزل ہم نے، اور تجھ کو سنا دی ہے
رنگوں کی ہنر مندی لفظوں میں چھپا دی ہے
جو بات بھی کہہ دی ہے، تصویر بنا دی ہے
اے صنفِ غزل تیری توقیر بڑھا دی ہے
تو اور جواں ہوگی، جا میں نے دُعا دی ہے
ہر سمت ڈھنڈھورا ہے، ہر سو یہ منادی ہے
عاجزؔ کو خوشی مت دو، وہ درد کا عادی ہے
تاعمر جگر تھامے رونے کی سزا دی ہے
واللہ ستمگر نے کیا دادِ وفا دی ہے
زخموں کو کسی نے بھی مرہم نہ دوا دی ہے
ہر کنڈی ہلائی ہے، ہر در پہ صدا دی ہے

ہشیاروں کے جھرمٹ میں بارات چلی زنداں
زنجیریں غزل خواں ہیں دیوانے کی شادی ہے
دل جلنے کا افسانہ پوچھو گے تو کہہ دوں گا
انگارہ رکھا کس نے، اور کس نے ہوا دی ہے
دیوانِ غزل عاجزؔ ایوانِ چراغاں ہے
اِک شعر نہیں لکھا، اِک شمع جلا دی ہے

غزل

ہاں چھیڑو غزل عاجزؔ چپ رہنے سے کیا ہوگا
کچھ لوگ تو خوش ہوں گے، وہ ہوگا خفا ہوگا
حشر اہلِ محبت کا جو ہوتا رہا ہوگا
دِل جوڑوگے گر دل سے، سر تن سے جدا ہوگا
جو زخم بھی وہ دیں گے، ہر زخم نیا ہوگا
آج اور مزا آیا، کل اور مزا ہوگا
ہونے کو ستم یوں تو کیا کیا نہ ہوا ہوگا
جیسا کہ ہوا ہم پر، ایسا نہ ہوا ہوگا
افسانۂ دل ہم سا کب کس نے کہا ہوگا
دل تھام لیا ہوگا ، جس نے بھی سنا ہوگا
یہ معجزہ شاعر سے اے بادِ صبا ہوگا
ہر پھول تر و تازہ ہر بوٹا ہرا ہوگا
ہم اہلِ محبت ہیں ، تاثیر بدل دیں گے
وہ زہر بھی گر دیں گے، اس میں بھی مزا ہوگا
ہر دَور میں دشمن کو ہم نے یہ دُعا دی ہے
تو نے تو بُرائی کی، جا تیرا بھلا ہوگا
شمشیر بکف قاتل اشعار بلب شاعر
تلواروں کا جرمانہ غزلوں سے ادا ہوگا

غزل

خدایا غزل کا اگر ساز دینا
مجھے میرؔ صاحب کا انداز دینا
وہ لہجہ جو ہے قابلِ ناز دینا
وہی سوز دینا، وہی ساز دینا
وہ آہنگ دینا اتر جائے دل میں
کلیجے کو چھولے وہ آواز دینا
مرے پاس کہنے کی باتیں بہت ہیں
مجھے بات کہنے کا انداز دینا
مجھے آسمانوں میں اڑنا نہیں ہے
دلوں کی فضاؤں میں پرواز دینا
غزل درد انگیز چھیڑی ہے ہم نے
ذرا درد والوں کو آواز دینا
بدل جائیں گی دوریاں قربتوں میں
میں آواز دوں گا تم آواز دینا
میں تنہا کلامی سے گھبرا گیا ہوں
مجھے کوئی یارب ہم آواز دینا
تمہیں جب ضرورت ہو خون جگر کی
میں آجاؤں گا مجھ کو آواز دینا
نئی شاعری شاعری ہی نہیں ہے
نئے شاعروں کو پھر آواز دینا
میں پھر اپنے اشعار میں جی اٹھا ہوں
مرے قاتلوں کو پھر آواز دینا
بہت خوش ہے عاجزؔ فقیری میں اپنی
اُسے کوئی عہدہ نہ اعزاز دینا

غزل

مرے بعد آنکھ ان کی ڈبڈبائے گی، مری جب یاد آئے گی
گھٹا امڈی تو بے برسے نہ جائے گی، مری جب یاد آئے گی
بہت بنتے ہیں کچھ بھی بن نہ آئے گی ، مری جب یاد آئے گی
یہ زنجیرِ تکلف ٹوٹ جائے گی ،مری جب یاد آئے گی
کلیجہ دھک سے ہو جائے گا سینے میں، بدن ہوگا پسینے میں
جگر میں ایک بجلی کوند جائے گی، مری جب یاد آئے گی
بہت سنسان ہوں گے آئینہ خانے ،دھرے رہ جائیں گے شانے
وہ زلفِ خم بہ خم پھر بل نہ کھائے گی، مری جب یاد آئے گی
صبا کو درد سوز و ساز بخشا ہے خرام ناز بخشا ہے
صبا بھی چلتے چلتے لڑکھڑائے گی مری جب یاد آئے گی
نہ بلبل کو ترانے یاد آئیں گے ،نہ سبزے لہلہائیں گے
کلی بھی مسکرانا بھول جائے گی، مری جب یاد آئے گی
یہ دنیا جو بہت اترائے چلتی ہے، مجھے ٹھکرائے چلتی ہے
مری غزلوں کو سینے سے لگائے گی، مری جب یاد آئے گی

غزل

مہہ و انجم کسی قابل نہ ہوں گے
اگر دنیا میں اہل دل نہ ہوں گے
غموں سے چور جب تک دل نہ ہوں گے
محبت کے مزے حاصل نہ ہوں گے
ملیں گے کیسے کیسے چارہ فرما
مگر آگاہِ درد دل نہ ہوں گے
گریباں چاک ہوں اور دل نہ ہوں چاک
ہم اُن دیوانوں میں شامل نہ ہوں گے

نظر آئیں گے کیا کیا حسن والے
مگر وہ پیار کے قابل نہ ہوں گے
جب انساں کا کوئی دشمن نہ ہوگا
بغل میں کیا جناب دل نہ ہوں گے؟
محبت میں بچے گی جان کیوں کر
حسیں جو ہوں گے کیا قاتل نہ ہوں گے؟
بہت ہوں گے جہاں میں زخم خوردہ
مگر میری طرح بسمل نہ ہوں گے
وہ محفل کیسی محفل ہوگی عاجزؔ؟
جہاں ہم رونقِ محفل نہ ہوں گے

غزل

میں اس کا غزل خواں ہوں اور وہ مری دشمن ہے
میں ابنِ مسلماں ہوں وہ بنت برہمن ہے
اس دور میں پھر زندہ دو مکتب فن ہے
پٹنہ کی میں جوگی ہوں ، دلی کی وہ جوگن ہے
سیندور ہے نہ چندن ہے، ٹیکہ ہے نہ کنگن ہے
سچ ہے کہ پیا جس کو چاہے وہ سہاگن ہے
اس کو تو نہیں مجھ کو اس کے لئے تڑپن ہے
یہ درد کا رشتہ ہے یہ پیار کا بندھن ہے
ہر سمت یہ منظر ہے، ہر سو یہی درشن ہے
گردن پسِ خنجر ہے، خنجر پسِ گردن ہے
دونوں ہی سیانے ہیں ،دونوں ہی کھلاڑی ہیں
میں اس کا سپیرا ہوں اور وہ مری ناگن ہے
جھٹکے تو بہت پہونچے ،جھونکے تو بہت آئے
اب تک اسی چولی سے اٹکا ہوا دامن ہے

کلیم عاجزؔ کے منتخب اشعار

❁

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دھواں اٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی
مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زلف تابہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی سامنے نہ بسر ہوئی

❁

جدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا
مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا
سلگنا اور شئے ہے ، جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام، پروانے سے کیا ہوگا

❁

وہ تو کہئے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے
بڑھ کے خود کانٹوں پہ رکھ دی ہم نے اپنی انگلیاں
اس سراپا ناز کا دامن بچانے کے لیے

❀

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا
کوئی بزم ہو، کوئی انجمن، یہ شِعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا

❀

حقیقتوں کا جلال دیں گے، صداقتوں کا جمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے
یہ عقل والے اسی طرح سے ہمیں فریب کمال دیں گے
جنوں کے دامن سے پھول چن کر خرد کے دامن میں ڈال دیں گے

❀

فن میں نہ معجزہ نہ کرامات چاہیے
دل کو لگے بس ایسی کوئی بات چاہیے
ہم کو کسی کی کم سخنی سے گلہ نہیں
لیکن کبھی تو پرسشِ حالات چاہیے

❀

جدا جب تک تری زلفوں سے پیچ و خم نہیں ہوں گے
ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے کم نہیں ہوں گے
ادھر آؤ تمہاری زلف ہم آراستہ کر دیں
جو گیسو ہم سنواریں گے کبھی برہم نہیں ہوں گے

❀

دن مرا ساز بنے رات غزل بن جائے
مرا مجموعۂ حالات غزل بن جائے
عشق کے ہاتھ کی مٹی بھی ہے سونا اے دوست
میں جو بھیجوں وہی سوغات غزل بن جائے

❀

یہ ہنسی خوشی کا موسم یہ بہار کا زمانہ
ترے واسطے حقیقت، مرے واسطے فسانہ
میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہو گیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ

❀

کہلواتا ہے جو دورِ جہاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نا مہر باں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے
ہر اک محفل میں جا کر ہم غزل کہتے نہیں لیکن
جہاں وہ شوخ ہوتا ہے، وہاں کہنا ہی پڑتا ہے

❀

یہ دیوانے کبھی پابندیوں کا غم نہیں لیں گے
گریباں چاک جب تک کر نہ لیں گے دم نہیں لیں گے
محبت کرنے والے بھی عجب خود دار ہوتے ہیں
جگر پر زخم لیں گے، زخم پر مرہم نہیں لیں گے

❀

آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی
فصل گل آتی رہی جاتی رہی
شمع و پروانہ کا جو انجام ہو
آپ کی محفل تو گرماتی رہی

❀

سخن عاجزؔ کا کیوں پیارا لگے ہے
یہ کوئی درد کا مارا لگے ہے
تم آخر بد گماں عاجزؔ سے کیوں ہو؟
وہ بے چارہ تو بے چارہ لگے ہے

❀

یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے
مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے
وہ آنکھیں پھیر لیں، میں کیسے پھیروں
محبت ہے اداکاری نہیں ہے

❀

بجھنے کا خیال آتا ہی نہیں روشن جو ہوئے اک شام سے ہم
تکلیف سلگنے ہی تک تھی جلتے ہیں بڑے آرام سے ہم
آج اپنے جھروکے پر بیٹھے پتھر ہمیں مارو ہو پیارے
کل پھول اچھالا کرتے تھے اُس بام سے تم اِس بام سے ہم

❀

کیا غم ہے اگر شکوۂ غم عام ہے پیارے
تو دل کو دکھا، تیرا یہی کام ہے پیارے
تیرے ہی تبسم کا سحر نام ہے پیارے
تو کھول دے گیسو تو بھری شام ہے پیارے

❀

نہ ہوں گے بادہ کش تو بادہ گلفام کیا ہوگا
یہ شیشہ یہ صراحی یہ سبو یہ جام کیا ہوگا
ہمارا حال اے ساقی ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا
تری محفل اگر اجڑی ترا انجام کیا ہوگا

❀

قفس میں لالہ و سرَو سمن کی بات کرتے ہیں
کہاں بیٹھے ہوئے کس انجمن کی بات کرتے ہیں
سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

❀

ہم تو کچھ چاہے ہیں تم چاہو ہو کچھ
وقت کیا چاہے ہے دیکھا چاہیے
بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

❀

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے
وہ آ گئے رَوِشِ میرؔ کی غزل والے
قلم لیے ہیں نئی شان سے غزل والے
نصیب جس کو بدلوانا ہو بدلوالے

❀

اس کی فکر نہ کیجیو عاجزؔ کون یہاں کیا بولے ہے
کرنے والا کام کرے ہے، بولنے والا بولے ہے
بنسی تو اک لکڑی ٹھہری بنسی بھی کیا بولے ہے
بنسی کے پردے میں پیارے کرشن کنہیا بولے ہے

❀

چھپالیا ہے مشقت نے عیبِ عریانی
ہے گرد جسم پہ اس طرح، پیرہن جیسے
غزل سنی تو وہ بولے کہ تم تو اے عاجز
ہو خوش کلام بھی ایسے ہی، کم سخن جیسے

❀

غرض کسی سے نہ اے دوستو! کبھو رکھیو
بس اپنے ہاتھ یہاں اپنی آبرو رکھیو
زمانہ سنگ سہی آئینے کی خو رکھیو
جو دل میں رکھیو وہی سب کے روبرو رکھیو

❁

پائے خرد سے وقت کی زنجیر کیا کھلے
آگے بڑھ اے جنوں کہ کوئی راستہ کھلے
عاجزؔ چُھری پہ ان کی کھلا یوں میرا لہو
جیسے دُلہن کے ہاتھ پہ رنگِ حنا کھلے

❁

جب کبھی عالم مستی میں غزل کہتے ہیں
آج کہہ دیتے ہیں ہم ، لوگ جو کل کہتے ہیں
آزمانا ہو تو آ بازو و دل کی قوت
تو بھی شمشیر اٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں

❁

اپنے دل کی بات شاعر بے حجابانہ کہے
چاہے پتھر کوئی مارے، چاہے دیوانہ کہے
کس نے سلجھائیں یہ زلفیں ،کیا یہ دیوانہ کہے
خود ترا آئینہ بولے، خود ترا شانہ کہے

❁

ہمیں ہے آئینہ، آئینہ ساز، آئینہ گر دیکھو
ادھر کیا دیکھتے ہو؟ اس طرف کیا ہے؟ ادھر دیکھو
سنا ہے تم کو ہم سے بے وفائی کی شکایت ہے
ذرا آنکھیں ملاؤ ہم سے، منہ پھیرو، ادھر دیکھو

❁

گذر جائیں گے جب دن گذرے عالم یاد آئیں گے
ہمیں تم یاد آؤ گے تمہیں ہم یاد آئیں گے
پھر ایسا آئینہ شاید ترے آگے نہ آئے گا
بہت ہم تجھ کو اے گیسوئے برہم یاد آئیں گے

❁

پتھر کی طرح تیری ہر اک بات لگے ہے
دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہات لگے ہے
ہم دونوں میں ہے بس اسی اک بات کی تکرار
وہ دن کہے ہیں اور ہمیں رات لگے ہے

❁

ہر راہ دیر و کعبہ سے آئی ہے میکدہ
ہر راہ میکدے سے گئی ہے بہشت کو
سب آئینے سب آئینہ خانہ انہیں سے ہیں
میں سنگ و خشت کیسے کہوں سنگ و خشت کو

❁

بیاں جب کلیم اپنی حالت کرے ہے
غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے
بھلا آدمی تھا پہ نادان نکلا
سنا ہے کسی سے محبت کرے ہے

❁

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل سے پتھر پھینک گئے
جس کو چوٹ لگی ہے پیارے اس کا ہی دل جانے ہے
جیسے جان نکالو ہو تم، میرا ہی دل جانے ہے
گردن کاٹ کے رکھ دینا تو ہر اک قاتل جانے ہے

ختم شد